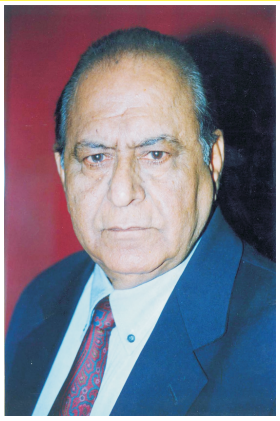

ISSN: 2581-5482
سہ ماہی
ادبی نشیمن
جون، جولائی، اگست ۲۰۲۲ء
ایڈیٹر
ڈاکٹر سلیم احمد
Cover design by INJILA
قیمت: ۲۵/روپے



اُردو زبان کے ہمہ صفت استاد، ادیب و ناقد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا انتقال

گنگا جمنی تہذیب کے ممتاز ترتشخص کے حامل اور اُردو زبان و ادب کی اپنی مثال آپ ہمہ جہت استاد (91 سالہ) ڈاکٹر گوپی چند نارنگ 15 / جون کو امریکہ میں انتقال کر گئے۔ نارنگ اِن دنوں اپنے ڈاکٹر بیٹوں کے پاس امریکہ میں تھے، موصولہ اطلاع کے مطابق ان کے بیٹے ہی نے اپنے والد کی سناونی دی جس میں بتایا گیا ہے کہ اُن کی موت نیند کی حالت میں ہوئی۔

پدم بھوشن گوپی چند نارنگ بلوچستان کی تحصیل دُکی ضلع لورالائی میں 11 فروری 1931 کو پیدا ہوئے تھے (ان کی جنم پتری میں سنہ 1930 درج ہے۔) گوپی چند نارنگ کے والد دھرم چند نارنگ بلوچستان میں ریونیو سروس میں افسر خزانہ کے عہدے پر فائز تھے۔ جب وہ ڈیڑھ سال کے تھے تو اُن کے والدین موسیٰ خیل چلے گئے۔ نارنگ کے بزرگوں کا آبائی وطن مغربی پنجاب میں لیہ ضلع مظفر گڑھ ہے (جو، اب پاکستان میں واقع ہے)۔ لیہ ضلع مظفر گڑھ میں ان کے اجداد صدیوں سے آباد تھے۔ ایک روایت کے مطابق گوپی چند نارنگ نے اُردو کا پہلا قاعدہ عبدالعزیز نامی ایک اُستاد سے پڑھا۔ نارنگ نے خود لکھا ہے کہ:

''(عبدالعزیز صاحب) ماسٹر، ہیڈ ماسٹر اور کلرک سبھی کچھ وہی تھے مَیں اُستاد سے کچھ کچھ ڈرا کرتا تھا اور اُس سے بھی زیادہ ڈر امتحان کا تھا جس کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا کہ (امتحان) ہے کیا بلا؟ جب پہلی جماعت کا امتحان ہوا تو مَیں گھر میں دُبکا رہا۔ بعد میں والد صاحب اور بڑے بھائی صاحب پکڑے پکڑے لائے اور (اُستاد سے) کہا، بیچارے کا سال برباد ہونے سے بچا لیجیے، عبدالعزیز صاحب نے (اُردو) قاعدے کا دوسرا صفحہ کھولا اور قدرے سختی سے کہا: یہاں سے سناؤ، دہشت تو طاری تھی ہی، مَیں نے بدحواسی میں قاعدہ بند کیا اور بجائے پڑھ کے سنانے کے، جیسے جماعت میں رٹا کرتا تھا، زبانی ہی سنانا شروع کیا، ابھی پورا سبق نہ سُنا پایا تھا کہ انھوں نے کہا: بس بس تم پاس، نہ صرف پاس بلکہ اوّل۔ والد صاحب نے گلے لگا لیا۔ آنسو پونچھے اور کندھے پر بٹھا کر گھر لے آئے، وہ دِن اور آج کا دن، کتاب میری بہترین رفیق اور دم ساز بن گئی۔''

نارنگ ابھی تیسری جماعت میں تھے کہ دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی اُس وقت بلوچستان کے قبائلی علاقوں میں حکومت کی طرف سے بے دریغ لٹریچر تقسیم ہوتا تھا اور یہ سارا لٹریچر پشتو اور اُردو میں ہوا کرتا تھا۔ اُردو پڑھنے کا چسکا گوپی چند نارنگ کو یہیں سے پڑا۔ پرائمری کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد نارنگ لیہ ضلع مظفر گڑھ چلے گئے کیونکہ جس علاقے میں ان کے والد کی ملازمت تھی وہاں ہائی اسکول نہیں تھے۔ اُردو اُن کا لازمی مضمون تھا اور سنسکرت اختیاری۔ مڈل کا امتحان انھوں نے اچھے نمبروں سے پاس کیا اور یہاں پر اُردو کی تعلیم انھوں نے مولوی مرید حسین سے حاصل کی، اپنے استاد مولوی مرید حسین کو وہ نہیں بھولے، اس استاد کے بارے میں نارنگ لکھتے ہیں: ''مَیں نے اُنھیں کبھی غصّے کی حالت میں آپے سے باہر ہوتے نہیں دیکھا، کسی کو بے جا پیٹتے بھی نہیں تھے۔ نہایت نرمی اور ہمدردی سے گفتگو کرتے اور پدرانہ شفقت سے پڑھاتے تھے۔ خدا جانے وہ اب زندہ ہیں بھی یا نہیں!!۔ اقبالؔ اور چکبستؔ کی نظمیں انھوں نے جس انداز میں پڑھائی تھیں، ابتک یاد ہیں۔ نذیر احمد، رتن ناتھ سرشارؔ اور راشد الخیری کی کتابیں انھیں بے حد پسند تھیں اور ہمیں بھی پڑھنے کو کہا کرتے تھے۔ مڈل کے بعد بھی مَیں مرید حسین صاحب سے اُردو پڑھنا چاہتا تھا، لیکن ہیڈ ماسٹر کے حکم سے سائنس کی جماعت میں بیٹھنا پڑا۔'' اس کے بعد نارنگ نے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ اس اسکول کے ہال میں سامنے کی دیوار پر آنرز بورڈ تھا۔ جس پر ہر سال میٹرک میں اوّل آنے والے طالب علم کا نام اور نمبر لکھے جاتے تھے نارنگ اس بورڈ کو حسرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، بہر حال اوّل آنے کی ان کی خواہش 1946 میں پوری ہوئی۔ اس کے بعد سب سے پہلے نارنگ سنڈے کالج کوئٹہ میں داخلے کے لیے پہنچے۔ یہاں اچھے نمبروں سے پاس ہونے کی وجہ سے فیس تو معاف ہوگئی لیکن وظیفہ نہ ملا۔ اس کے بعد وہ لائل پور کے زراعتی کالج کی طرف بڑھے مگر وہاں پہنچنے سے قبل ہی داخلہ نمٹ چکا تھا۔ جب داخلے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو 1947 میں وہ اپنی والدہ اور بھائی بہنوں کے ساتھ دہلی چلے آئے لیکن اُن کے والد وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد 1956 میں دہلی آئے۔ کسی طرح سے انھوں نے ایف اے اور بی اے کی تعلیم حاصل کی۔ 1952 میں گوپی چند نارنگ نے دہلی کالج میں ایم اے اُردو میں داخلہ لیا اور پھر انھوں نے 1958 میں یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے مقالے کا موضوع ''اُردو شاعری میں ہندستانی عناصر'' تھا۔ دہلی کالج کے تذکرے میں وہ اپنے کرم فرما ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہیں ان سے ملاقات ہوئی جن کی محنت کوشی، ذوقِ مطالعہ اور کام کی دُھن نے میرے شوق کو مہمیز کیا۔ رسائل میں لکھنے کی لت لڑکپن سے پڑ چکی تھی، ابتدا افسانہ نگاری سے ہوئی، میرا پہلا افسانہ جب کوئٹہ کے ہفتہ وار 'بلوچستان سماچار' میں شائع ہوا تو اُس دن پاؤں زمین سے کچھ اوپر ہی اوپر تھے۔ رائے دینے یا دل بندھانے والا سوائے بڑے بھائی کے اور کوئی نہیں تھا اور ان ہی کو دِکھا کر یوں محسوس ہوا گویا---ساری دُنیا کو دِکھا آیا۔ اس کے بعد دہلی آ کر (دیوان سنگھ مفتوں کے پرچے) ریاستؔ، بیسویں صدی وغیرہ میں لکھتا رہا۔''

نارنگ نے اپنے لکھنے لکھانے اور چھپنے چھپانے کا ذکر جس طرح کیا ہے اس میں ان کے شوق اور علمی محنت کشی نئی نسل کے لیے کسی درس سے کم نہیں:

''گھر کے قریب ایک سرکاری لائبریری تھی ''کلاس فور'' یعنی چپراسیوں کے لیے، شاید اسی لیے اُردو ہندی کی کتابوں کا اس میں خاصا ذخیرہ تھا۔ سارا سارا دِن وہیں پڑا رہتا۔ یاد ہے کہ اُردو فارسی کے بعض امتحان مَیں نے یا تو اس لائبریری کی وجہ سے دِیے یا پھر (دہلی کے) اُردو بازار کے بعض مہربان کتب فروشوں کی نوازش سے، جو کتاب چند روز پڑھنے کے لیے دیدیتے

جون تا اگست
۲۰۲۲ء
ISSN: 2581-5482
جلد : ۵
شمارہ : ۳

سہ ماہی

ادبی نشیمن

ADABI NASHEMAN

ایڈیٹر
ڈاکٹر سلیم احمد
Mob: 8707260591, 9415693119
saleemahmad110@gmail.com
adbeenasheman@gmail.com

معاون ایڈیٹر
شاہد حبیب
Mob: 8539054888
shahidhabib10@gmail.com

ادبی مشیر
رفعت عزمی
Mob: 9451818310
rafatsafavi@gmail.com

قیمت

فی شمارہ	:	۴۵/روپئے
دوسالہ ممبرشپ مع رجسٹرڈ ڈاک	:	۳۰۰/روپئے
بیرونی ممالک (ہوائی جہاز ڈاک)	:	$15 (امریکی ڈالر)
لائف ٹائم ممبرشپ	:	پانچ ہزار روپئے
لائبریری/ادارہ کے لئے	:	۶۵/روپئے فی شمارہ

ترسیل زر (منی آرڈر) کا پتہ
سہ ماہی ادبی نشیمن
168/C-544 الماس باغ، ہردوئی روڈ، لکھنؤ

Bank Detail

Name : Adbee Nasheman
Bank : Indian Bank, Lucknow
Branch : Balaganj
A/c No : 50489096237
IFSC : IDIB000L558

Address

Editor Urdu Quarterly
ADABI NASHEMAN
544-C/168,Almasbagh
Hardoi Road, Lucknow-03

مجلس ادارت

ڈاکٹر غلام حسین (اجین) — ڈاکٹر رضی الرحمٰن (گورکھپور)
ڈاکٹر مجاہدالاسلام (لکھنؤ) — ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی
ڈاکٹر شکیل احمد (مئو) — وصی اللہ حسینی (لکھنؤ)

تزئین کار : عبدالسمیع قاسمی (Mob:9335737053)

ادبی نشیمن میں شائع ہونے والے تمام مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے اس کی ساری ذمہ داری مصنف کی ہوگی۔ ادارے کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔

پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر احمد رشیق نے نعمانی پرنٹنگ پریس، بارودخانہ، گولہ گنج لکھنؤ سے چھپوا کر 168/544-e، الماس باغ ہردوئی روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا۔
ایڈیٹر: ڈاکٹر سلیم احمد

فہرست عنوانات

آغاز

۱	حمد	ڈاکٹر محمد کلیم ضیا	۳
۲	نعت	ڈاکٹر ریشا قمر	۳

اداریہ

۳	نظریہ	ایڈیٹر	۴

مضامین

۴	رباعی اور اس کے اوزان	ڈاکٹر اختر ریاض	۵
۵	مطالعۂ ولی کا تنقیدی تجزیہ	پروفیسر شمس الہدیٰ	۱۳
۶	ناصر کاظمی کے شعری افق	انس مسرور انصاری	۱۸
۷	مرزا ہادی رسواؔ اور عبدالحلیم شررؔ لکھنوی کی ادبی رقابت	ڈاکٹر ناظم حسین خان	۲۲
۸	کچھ دیر ظفرؔ اقبال ظفرؔ کے ساتھ	پروفیسر علیم اللہ حالی	۲۴
۹	خان محبوب طرزی کی بازیافت: ڈاکٹر عمیر منظر کا نیا کارنامہ	منظور پروانہ	۲۶
۱۰	سعد اللہ اسود کی ''خاموش مسافت''	مسعود تنہا	۲۹
۱۱	چودھری محمد علی ردولوی کے خطوط میں خطوطِ غالبؔ کی جھلک	نادرہ پروین	۳۱
۱۲	منشا یاد کی افسانہ نگاری (شب خون کے حوالے سے)	عافیہ حمید	۳۴
۱۳	دبستانِ سیماب کا ایک انقلابی شاعر: الطاف مشہدی	محمد صالح انصاری	۳۷
۱۴	مستقبل کی آماجگاہوں کا چراغ: سرسید احمد خاں	انصاری شاہین عبدالحکیم	۴۱
۱۵	نظر نظر منظر ایک جائزہ (منظر صدیقی کا شعری مجموعہ)	ڈاکٹر احسان عالم	۴۵
۱۶	حافظ الملک حافظ رحمت خاں اور ان کے کارنامے	زرغونہ خان	۴۷

انٹرویو

۱۷	ایک معیاری مقالہ لکھنا بھی کبھی کبھی ایک کتاب لکھنے کے مساوی ہوتا ہے: پروفیسر مقبول	مصاحبہ کار: چاند اکبر	۵۰

افسانہ

۱۸	دیا نندا ری	فرحانہ نازنین	۵۶
۱۹	بنجر	سدرا علی احمد	۵۸

غزلیات

۲۰	غزل	ڈاکٹر آفتاب عرشیؔ	۱۷
۲۱	دوہے	ڈاکٹر حبیب راحت حباب	۲۵
۲۲	غزلیں	ڈاکٹر فریاد آزرؔ / طارق سخاؔ لکھنوی	۶۲
۲۳	غزلیں	ساجد عارفی خیرآبادی / شاہین زیدی (لاہور)	۶۳

تبصرے

۲۴	سہ ماہی عالمی فلک (کتابی سلسلہ ۶)	مدیر: احمد نثار	۶۴

حمدِ باری تعالیٰ

ڈاکٹر محمد کلیم ضیاؔ

سابق صدر شعبۂ اردو، اسماعیل یوسف کالج، جوگیشوری مغرب، ممبئی۔ 98929 33626

پئے حمد یارب اٹھا ہے قلم
ثنا تیری کیسے ہو اِس سے رقم
زمیں و زماں تیرے محتاج ہیں مکیں و مکاں تیرے محتاج ہیں
یقیں و گماں تیرے محتاج ہیں سبھی انس و جاں تیرے محتاج ہیں
ہمیں چاہیئے صرف تیرا کرم
پئے حمد یارب اٹھا ہے قلم
تری ذات مولا غفور الرحیم ازل تا ابد تو ہی بے شک قدیم
نہیں دوسرا کوئی تجھ سا عظیم سدا دل میں رہنا ہمارے مقیم
کہ گھر دل میں کرنے نہ پائیں صنم
پئے حمد یارب اٹھا ہے قلم
عیاں تیرے اوصاف ہیں سو بہ سو نمایاں ہیں جلوے ترے کو بہ کو
رہے دل میں زندہ تری جستجو رہے جسم و جاں میں فقط تو ہی تو
ملوث ہیں عصیاں سے سر تا قدم
پئے حمد یارب اٹھا ہے قلم
ہم انجام سے اپنے ہیں بے خبر بچانا ہمیں مالکِ بحر و بر
نہیں تجھ سے اعلیٰ کوئی راہبر کٹھن ہے بہت زندگی کا سفر
رہے تیری ہم پہ بھی چشمِ کرم
پئے حمد یارب اٹھا ہے قلم
اندھیرا نگاہوں میں ہے یوں بسا کہ مفلوج جیسے ہو فکرِ رسا
ہمیں ہر قدم راستی پر چلا ہمیں تُو اُجالوں کا رستہ دِکھا
رہیں راہِ ایماں پہ ثابت قدم
پئے حمد یارب اٹھا ہے قلم
رہے دور میں تیری رحمت کا جام عنایت رہے تیری ہم پہ مدام
تری حمد کرتے رہیں صبح و شام زباں پہ رہے ایک تیرا ہی نام
ترے سامنے سر ہمارا ہے خم
پئے حمد یارب اٹھا ہے قلم
پریشاں ہیں آخر کدھر جائیں گے نہ ہو گا کرم تو بکھر جائیں گے
ترے در سے ہٹ کر اگر جائیں گے یقیں ہے کہ بے موت مر جائیں گے
ملے نورِ حق کی ضیاؔ کم سے کم
پئے حمد یارب اٹھا ہے قلم

☆☆☆

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ڈاکٹر ریشا قمر

شعبۂ اردو، گلبرگہ یونیورسٹی، کلبرگی (کرناٹک)

نورِ ربُّ العلیٰ یا نبی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شمس الضحیٰ یا نبی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عشق ہے دو جہاں کی بقا
اے حبیبِ خدا یا نبی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

دو جہاں کی اسے رحمتیں مل گئیں
جو ہوا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یا نبی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ہے خدا کی اطاعت، اطاعت تری
خود خدا نے کہا یا نبی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کاش طیبہ نگر ہو مری حاضری
اور دوں میں صدا یا نبی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جس گھڑی چوم لوں گی میں در آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا
مجھ کو آئے قضا یا نبی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

صبحِ باراں ہے اور نور ہی نور ہے
ہے معطر فضا یا نبی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ہو ریشاؔ پہ بھی آج چشمِ کرم
سید الاسخیاء یا نبی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

☆☆☆

اداریہ



سوشل میڈیا پر کبھی کبھار یہ بحث چھڑ جایا کرتی ہے کہ انگریزی الفاظ کی جمع عربی یا فارسی قواعد کے لحاظ سے بنانا کہاں تک درست ہے مثلاً ممبر سے ممبران، اسکیم سے اسکیمات، لیڈر سے لیڈران، نمبر سے نمبرات وغیرہ وغیرہ کچھ لوگوں کو اعتراض ہوتا ہے کہ انگریزی الفاظ میں ''وں'' جوڑ کر جمع بنانا مناسب نہیں ہے۔ اعتراض اس بات کا ہے کہ انگریزی لفظ کی جمع انگریزی قواعد کے مطابق ہونی چاہئے یعنی پروگرام کی جمع پروگرامس، ممبر کی جمع ممبرس، کالج کی کالجز وغیرہ وغیرہ۔

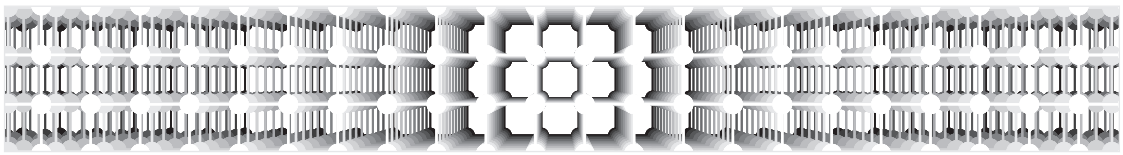
یہ سچ ہے کہ عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت، عبرانی زبانوں اور برج بھاشا کو اپنی گود میں سمیٹنے کی وجہ سے جو زبان وجود میں آئی اسے اردو کہا جاتا ہے۔ یہ وہ زبان ہے جس کا دائرہ کافی وسیع ہے اس زبان نے وقت کے لحاظ سے زبان کی پیچیدگیوں کی جگہ اسے آسان اور عام فہم بھی بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ آج انگریزی کے بہت سے الفاظ جسے عام قاری آسانی سے سمجھ سکتا ہے اردو میں رائج ہو گئے ہیں۔ صحافت نے تو ایسے تمام الفاظ کو اپنے اندر سمیٹ کر نئی اصطلاحات پیدا کیں حالانکہ صحافت میں بھی انگریزی کے انھیں الفاظ کا استعمال کیا گیا جو کثرت سے بولے جاتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو اب فارسی کے الفاظ کو فارسی اور عربی کے الفاظ کو عربی قواعد کے مطابق جمع بنانے کا طریقہ بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں اردو میں ہر اس زبان کے الفاظ کا کشادہ قلبی کے ساتھ استقبال کرنا چاہئے جس سے زبان کو وسعت حاصل ہو۔ اگر ہم اردو زبان میں صرف عربی اور فارسی زبان کے قاعدے کے مطابق جمع بنانے لگیں تو اردو کی ترویج خاصی مشکل ہو جائے گی اور اس کا بھی حال سنسکرت کے جیسا ہو جائے گا۔ در اصل اردو میں ابتدا ہی سے جمع بنانے کا رواج ہندوستانی نہج پر کیا گیا ہے اور بیشتر ادباء و شعراء نے عربی، فارسی، ترکی زبانوں کے الفاظ کا جمع ''وں'' کا اضافہ کر کے بنانے کو ترجیح دی ہے اور غیر ضروری طور پر عربی اور فارسی الفاظ کی جمع اِن زبانوں کے قاعدے کے مطابق بنانے سے گریز کیا ہے۔ بہر حال ہماری زبان کے تشکیلی دور کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا ہے، اس لیے اس نوع کی تحقیقات کے لیے ادبی نشیمن کے صفحات کبھی بھی تنگ دامنی کا شکوہ نہیں کریں گے۔ اہلِ نظر اپنے قیمتی افکار ادبی نشیمن کی خدمت پیش کر سکتے ہیں۔ ہم شکر گزار رہیں گے۔

''حکومت کے رحم و کرم پر زبانیں زندہ نہیں رہتیں بلکہ عوام انھیں زندہ جاوید بناتے ہیں'' اس طرح کے اقوال ہمیں بارہا سنائی دیتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ کسی بھی زبان کی بقا اور ترویج کا تعلق براہ راست عوام سے ہوتا ہے۔ اردو ہندوستانی زبان ہے جو دہلی اور اس کے اطراف میں برج بھاشا اور کھڑی بولی کے امتزاج سے پیدا ہوئی۔ لیکن اسے سازش کے تحت ایک مذہب سے اور ایک خاص طبقے سے جوڑ دیا گیا۔ جو سراسر ناانصافی ہے۔ یہ کام وہی تنگ نظر ذہنیت کے لوگ انجام دیتے رہے ہیں جنھیں لسانیات اور تاریخ کا کوئی علم نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اردو کے سرکاری ادارے نہ ہوتے تو آج اردو کا جو حال ہے اس سے کہیں بد تر صورت ہوتی کیونکہ حکومتوں کی جانب سے تشکیل کردہ اردو اداروں کے مالی تعاون کی بدولت کثیر تعداد میں آج کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں نیز کتابوں پر حوصلہ افزائی کے لیے سالانہ انعامات دینے کا نظم ہے۔ معمر شعراء و ادباء کو پینشن دی جا رہی ہے۔ سیمیناروں اور مشاعروں کے لیے خطیر رقم اردو کے فروغ کے نام پر دی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ رضا کار تنظیمیں حکومت کی مراعات کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کا بے جا استعمال کر رہی ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب حکومت کے رحم و کرم کا ہی نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج حکومت کروڑوں روپے اردو کے فروغ کے لیے سرکاری اداروں کو دے رہی ہے اب اس کا صحیح استعمال کہاں پر کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے یہ ہماری ذمہ داری بنتی ہے۔

اتر پردیش کی ۱۸ ویں اسمبلی کی 403 نشستوں میں سے کل 34 مسلم امیدوار کامیاب ہوئے۔ ان میں سے صرف چار اراکین اسمبلی نے اردو میں حلف لیا۔ یہ سبھی ممبران واقعی قابلِ مبارک باد ہیں۔ ہم فرداً فرداً محترم ضیاء الرحمٰن برق، عالم بدیع نفیس احمد اور ضیاء الدین صاحبان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں، کہ آپ نے اپنی زبان کے تحفظ اور بقا کی خاطر ایک اہم پیش رفت میں حصہ لیا۔ باقی ماندہ ۳۰ / اراکین نے اپنی مادری زبان میں عہدے اور رازداری کا حلف لینا مناسب نہیں سمجھا، یہ ایک افسوس ناک امر ہے۔ ہمیں اس طرف ان کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اردو کی موجودی صورت حال کو ذہن میں رکھ کر ہر شعبۂ حیات کے افراد کو گنگا جمنی تہذیب کی امین زبان کے تحفظ کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے۔ یہ ہمارا قومی و ملی فریضہ ہے۔ اس لیے اس کے تعلق سے ہمیں سنجیدگی سے غور کرتے ہوئے ہمیں ایک جامع لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا اور اسی کی روشنی میں پیش قدمی کرنی ہوگی۔

رسالہ پریس میں جانے کے لئے تیار تھا کہ اک انہونی خبر پروفیسر گوپی چند نارنگ کے انتقال کی موصول ہوئی۔ یہ ادبی دنیا کے لئے انتہائی تکلیف دہ خبر ہے۔ ادبی نشیمن پریواران کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے اور زیر نظر شمارے کا دستاویزان کو معنون کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ادبی نشیمن کا یہ شمارہ کئی قیمتی موضوعات کا احاطہ کر رہا ہے۔ ہمیں اپنے قارئین کے تفصیلی آراء کا انتظار رہے گا۔ شکریہ

ڈاکٹر سلیم احمد



رباعی اوراس کے اوزان

ڈاکٹر اختر ریاض (IAS)
(جھانسی، موبائل: 9918226052)

رباعی عربی لفظ ''رباع'' کے آگے یائے نسبتی بڑھا کر بنایا گیا ہے جس کے لغوی معنی چار- چار کے ہیں۔ اصطلاحاً رباعی سے وہ شعری ہیئت مراد ہے جو چار مصرعوں پر مبنی ہو اور فکر وخیال کے لحاظ سے مکمل ہو۔ رباعی کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے جبکہ تیسرا بے قافیہ۔ لیکن اگر تیسرا مصرع بھی ہم قافیہ ہو تو اسے افضل سمجھا جاتا ہے۔ رباعی کے قافیے مردف بھی ہو سکتے ہیں اور غیر مردف بھی۔ رباعی کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے اصطلاحاً ''مصرّع'' کہلاتے ہیں اور تیسرا بے قافیہ ہونے کے سبب ''خصّی'' کہا جاتا ہے۔ ایسی رباعی جس کے چاروں مصرعے مقفیٰ ہوں اسے ''غیر خصّی'' کہتے ہیں۔ لیکن اس ظاہری ہیئت کی بنا پر ہم اسے رباعی نہیں کہہ سکتے بلکہ رباعی کی صنفی شناخت اس کے مخصوص اوزان سے ہوتی ہے جو کہ بحر ہزج سے مستخرج ہیں۔ رباعی کا ابتدائی نام ترانہ تھا۔ ایک مطلع اور ایک شعر کی وجہ سے اس کا نام دوبیتی بھی رہا ہے۔ چار مصرعوں کے سبب اسے چہار مصراعی بھی کہا گیا ہے۔

جہاں تک رباعی کے اوزان کے استخراج کا سوال ہے اس سلسلے میں کئی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہیں۔ صاحب معیار البلاغت نے صفحہ ۱۰۸-۱۰۷ پر لکھا ہے کہ رباعی جس کو ترانہ اور دوبیتی اور جفتی اور چار مصراعی بھی کہتے ہیں، متفق الوزن والقوافی ہیں اور اس کا موجد رودکی ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ رودکی ایک روز راہ میں چلا جا رہا تھا، دیکھا کہ امیر یعقوب بن لیث صفار کا بیٹا جوز کو گوچی میں ڈالنا چاہتا ہے۔ ایک بار میں اس نے گوچی میں چھے جوز ڈال دئے اور ایک دور جا پڑا لیکن وہ بھی لڑھک کر گوچی میں جا پڑا۔ لڑکا خوشی سے اچھل پڑا اور کہنے لگا ''غلطاں غلطاں ہمے رود تا بن گو''۔ رودکی کو یہ کلمات بہت فصیح لگے اور غور کیا تو اسے بحر ہزج (مفعولن فاعلن مفاعیلُ فَعَلن) میں موزوں پایا اور اسی وقت اس نے تین مصرعے اس پر اور کہے۔ جب رودکی کی یہ رباعی مشہور ہوئی تو اور شاعروں نے بھی اس میں طبع آزمائی کی اور رفتہ رفتہ یہ آہنگ اپنی موسیقیت کی بنا پر اس قدر مقبول ہوا کہ اسے ترانہ کہنے لگے۔ پھر اس نے اس وزن سے چوبیس اوزان اختراع کئے۔ تذکرۂ دولت شاہ میں بیان ہے کہ یعقوب بن صفار کا بیٹا عید کے دن لڑکوں کے ساتھ جوز بازی کرتا تھا۔ امیر بھی اس کے پاس کھڑا ہو کر تماشا دیکھنے لگا۔ امیر زادے نے جوز گوچی کی طرف پھینکے جن میں سے سات گوچی میں چلے گئے لیکن ایک اچھل کر باہر آ گیا۔ امیر زادہ ناامید ہو گیا لیکن تھوڑی دیر بعد وہ بھی لڑھک کر گوچی میں چلا گیا۔ فرط خوشی سے اس کے منھ سے یہ الفاظ نکلے ''غلطاں غلطاں ہمے رود تا لبِ گو''۔ یعقوب کو یہ کلام پسند آیا اور حکم دیا کہ اس کو جانچیں کہ یہ کس بحر میں ہے۔ ابودلف اور زینت الکعب نے اس کی تقطیع کی تو اس کو بحر ہزج میں موزوں پایا اور ایک مصرع اس کے ساتھ لگا دیا۔ پھر ایک اور بیت بڑھا کر اسکو دوبیتی بنا دیا اور یہی نام مشہور ہو گیا۔ بعد میں یہ نام موقوف

کر کے اس کا نام رباعی رکھ دیا گیا۔ ابن قیس نے المعجم میں لکھا ہے کہ اس کو ترانہ اس لئے کہتے ہیں کہ ارباب موسیقی نے اس وزن پر اچھے اچھے راگ بنائے ہیں اور صرف اشعار کے لحاظ سے دوبیتی کہتے ہیں کیونکہ اس میں دو بیت سے زیادہ نہیں اور عرب مستعربہ اس کو رباعی کہتے ہیں کیونکہ یہ بحر ہزج میں ہے۔ ابن قیس نے یہ بھی لکھا ہے کہ خواجہ امام حسن قطان نے چوبیس اوزان کے منضبط ہونے کے لئے دو شجرہ، شجرۂ اخرب اور شجرۂ اخرم ایجاد کر کے انھیں لکھا۔ غرض کہ اس میں زحاف نو آتے ہیں۔ خرب، خرم، قبض، کفّ، ہتم، جبّ، بتر، شتر اور زلل اور اوزان مزاحف یا مزاحف وسالم باہم مرکب ہو کر بعض کے نزدیک اٹھارہ اور بعض کے نزدیک چوبیس اوزان حاصل ہوتے ہیں اور ان سب کا اجتماع جائز ہے۔ لیکن قطان کا یہ کہنا مناسب نہیں کیونکہ رودکی کے اوزان رباعی میں صرف چھے زحاف خرب، قبض، کفّ، جبّ، ہتم اور تخنیق کے عمل سے مروجہ چوبیس اوزان تشکیل پاتے ہیں۔ مؤلف غیاث کا کہنا ہے کہ رباعی کا وزن خاص لاحولُ ولاقوت الاّ باللہ (مفعولُ مفاعیلن مفعولن فاعْ) ہے۔ اگر اس وزن میں نہ ہو تو قطع کہیں گے لیکن یہ تعریف جامع نہیں کیونکہ رباعی کے چوبیس اوزان ہیں اور انھیں میں ایک وزن لاحولُ ولاقوت الاّ باللہ ہے۔

اس تمام طول کلامی کا مقصد صرف یہ ہے کہ قارئین کے ذہن میں رباعی کی تاریخی وفنی حیثیت واضح ہو جائے۔ بہرکیف! زیادہ تر علما کا خیال ہے کہ رباعی کا موجد رودکی ہے جس کی بنیاد اس نے غلطاں غلطاں ہمی رود تالبِ گو/گور (مفعولن فاعلن مفاعیلُ فَعَلْ/فعول) پر رکھی لیکن یہ مصرع بحر رجز مثمن، بحر رمل مثمن، بحر منسرح مثمن، بحر عمیق مثمن اور بحر ہزج مثمن میں بھی ڈبویا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

1۔ بحر رجز مثمن مزاحف: غلطاں غلطاں ہمے رود تالبِ گو

غَلْطَاً	غَلْطَاً	ہمی رَوَدْ	تاَلَبِ گُوْ
فعْلن	فعْلن	مفاعلن	مفتَعِلن
مرفوع مخبون مسکن	مرفوع مخبون مسکن	مخبون	مطوّی

۲۔ بحر رمل مثمن مزاحف: غلطاں غلطاں ہمے رود تالبِ گو

غَلْطَاْغَلْ	طَاْہمی رَ	وَدْتاَلَ	بِ گُوْ
مفعولن	فاعلاتُ	مفعولُ	فَعَلْ
مخبون مسکن	مکفوف	مشکول مسکن	مربوع

۳۔ بحر منسرح مثمن مزاحف: غلطاں غلطاں ہمے رود تالبِ گو

غَلْطَاْغَلْ	طَاْہمی رَ	وَدْتاَ	لَبِ گُوْ
مفعولن	فاعلاتُ	فعْلن	فعِلن
مطوّی مسکن	مطوّی	مرفوع مخبون مسکن	مخبول مکشوف

۴۔ بحر عمیق مثمن مزاحف: غلطاں غلطاں ہے رودتالبِ گو

غَلْطَاْ	غَلْطَاْہَ	مِیْ رَوَدْ	تَاْلَبِیْ گُوْ
فعْلن	مفعولُ	فاعلن	فاعلاتن
مخبون مسکن	مشکول مسکن	سالم	سالم

۵۔ بحر ہزج مثمن مزاحف: غلطاں غلطاں ہے رودتالبِ گو/گور

غَلْطَاْغَنْ	طَاْبَہِیْ	رَوَدْتَاْلَ	بِگُوْ/ بِگُوْرْ
مفعولن	فاعلن	مفاعیلُ	فَعَنْ/فعولْ
اخرب	مقبوض مخنق	مکفوف	مجبوب/اہتم

رودکیؔ نے جب بحر ہزج مثمن مزاحف کے آہنگ پر غور کیا تو اسے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ فاعلن جو مذکورہ وزن کے حشو میں نظر آرہا ہے وہ یہاں اشتر ہو کر نہیں آیا ہے بلکہ تخنیق کے عمل سے وجود میں آیا ہے کیونکہ زحاف شتر صدر وابتدا سے مخصوص ہے۔ اس لئے رودکیؔ نے بحر ہزج مثمن پر غور کر کے دو آہنگ ایجاد کئے جسکا پہلا رکن اخرب، دوسرا رکن مکفوف/مقبوض، تیسرا رکن مکفوف اور چوتھا رکن مجبوب/اہتم ہوتا ہے۔

۱۔ مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فَعَنْ/فعولْ
اخرب مکفوف مکفوف مجبوب/اہتم

۲۔ مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فَعَنْ/فعولْ
اخرب مقبوض مکفوف مجبوب/اہتم

ان دو بنیادی اوزان پر رودکیؔ نے زحاف تخنیق، اصول معاقبہ اور سبب پۓ سبب است اور وتد پۓ وتد است[1] سے چوبیس اوزان ایجاد کئے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر رودکیؔ نے رباعی کو بحر ہزج سے ہی کیوں منسوب کیا، دوسری بحروں سے کیوں نہیں جبکہ اس کے اوزان دوسری بحروں میں بھی ڈوب جاتے ہیں۔ اسکی کئی وجہیں نظر آتی ہیں:

۱۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ تخنیق کے عمل سے بحر ہزج سے جو آہنگ یا اوزان حاصل ہوتے ہیں وہ کسی دوسری بحور کے مزاحف آہنگ سے حاصل نہیں ہوتے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ رودکیؔ نے رباعی کے جو چوبیس اوزان ایجاد کئے وہ سبب پۓ سبب است اور وتد پۓ وتد است کی ترتیب سے وجود میں آتے ہیں اور معاقبہ کا عمل بھی کارفرما ہے۔

[1] سبب پۓ سبب است اور وتد پۓ وتد است کا تعلق ماقبل رکن کے آخری جزو اولیٰ اور مابعد رکن کے اولین جزو اولیٰ سے ہے۔ یعنی اگر پہلے رکن کا آخری جزو سبب یا وتد ہے تو اس کے بعد آنے والے رکن کا پہلا جزو بھی سبب یا وتد ہونا ضروری ہے۔ یہاں اس سے کوئی واسطہ نہیں کہ وہ وتد مجموع ہے یا وتد مفروق۔ صرف وتد ہونا چاہئے۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اوزان رباعی کے اخراج میں صرف چھے زحاف۔ خرب، قبض، کفّ، جبّ، ہتم اور تخنیق کا ہی عمل ہوتا ہے۔ لیکن کچھ عروضی اپنی لاعلمی کی وجہ سے رباعی کی ایجاد میں مفعولن کو اخرم، فاعلن کو اشتر، فَعَ کو ابتر اور فَاْ کو ازل تصور کرتے ہیں جو کہ صحیح نہیں کیونکہ:

۱۔ یہ حضرات زحاف بتر کو جبّ اور خرم کا اجتماع سمجھتے ہیں جو کہ غلط ہے کیونکہ خرم صدر وابتدا سے مخصوص ہے اور جبّ عروض وضرب سے۔ لہٰذا دونوں کا اجتماع ممکن نہیں۔

۲۔مفعولن سے شروع ہونے والے اوزان میں فاعلن کا حشو میں نظر آنا زحاف شتر کے سبب نہیں ہوتا بلکہ یہ عمل تخنیق کا نتیجہ ہے کیونکہ زحاف شتر صدر وابتدا سے مخصوص ہے۔

۔فَاعْ زلل نہیں بلکہ اسکو اہتم مخنق کہنا زیادہ مناسب ہے۔

انھیں وجوہات کی بنا پر رودکی نے رباعی کو بحر ہزج سے منسلک کیا۔

رودکی کے ایجاد کردہ بنیادی اوزان اس طرح ہیں:

بنیادی اوزان

۱	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعیلُ	فَعَلْ/فعولْ
۲	مفعولُ	مفاعلن	مفاعیلُ	فَعَلْ/فعولْ

ان دو بنیادی اوزان (فَعَلْ اور فعولْ یعنی عروض وضرب کو الگ الگ شمار کریں تو چار بنیادی اوزان) پر تخنیق کے عمل سے کل چوبیس اوزان حاصل ہوتے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

پہلے بنیادی وزن پر عمل تخنیق سے برآمد سولہ اوزان اس طرح ہیں:

۱۔	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعیلُ	فَعَلْ
	اخرب	مکفوف	مکفوف	مجبوب
۲۔	مفعولن	مفعولُ	مفاعیلُ	فَعَلْ
	اخرب	مکفوف مخنق	مکفوف	مجبوب
۳۔	مفعولُ	مفاعیلن	مفعولُ	فَعَلْ
	اخرب	مکفوف	مکفوف مخنق	مجبوب
۴۔	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعیلن	فَعْ
	اخرب	مکفوف	مکفوف	مجبوب مخنق
۵۔	مفعولن	مفعولن	مفعولُ	فَعَلْ
	اخرب	مکفوف مخنق	مکفوف مخنق	مجبوب
۶۔	مفعولن	مفعولُ	مفاعیلن	فَعْ
	اخرب	مکفوف مخنق	مکفوف	مجبوب مخنق
۷۔	مفعولُ	مفاعیلن	مفعولن	فَعْ
	اخرب	مکفوف	مکفوف مخنق	مجبوب مخنق
۸۔	مفعولن	مفعولن	مفعولن	فَعْ
	اخرب	مکفوف مخنق	مکفوف مخنق	مجبوب مخنق

اوراسی طرح:

۵۔	مفعولُ	مفاعلن	مفاعیلُ	فعولُ
	اخرب	مقبوض	مکفوف	اہتم
۶۔	مفعولن	فاعلن	مفاعیلُ	فعولُ
	اخرب	مقبوض مخنق	مکفوف	اہتم
۷۔	مفعولُ	مفاعلن	مفاعیلن	فَاُعْ
	اخرب	مقبوض	مکفوف	اہتم مخنق
۸۔	مفعولن	فاعلن	مفاعیلن	فَاُعْ
	اخرب	مقبوض مخنق	مکفوف	اہتم مخنق

اس طرح ان دو بنیادی اوزان پر تخنیق کے عمل سے کل چوبیس اوزان حاصل ہوتے ہیں اور یہی چوبیس اوزان رباعی کے مخصوص روایتی اوزان ہیں اور اگر ہم مذکورہ بالا اوزان پر غور کریں تو یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ بارہ اوزان مفعولُ سے شروع ہوتے ہیں اور بارہ اوزان مفعولن سے۔ رباعی کی شرط بھی یہی ہے کہ رباعی کے ہر وزن کے صدر و ابتدا میں مفعولُ یا مفعولن کا آنا لازم ہوگا۔ نیز اس میں سبب کے بعد سبب اور وتد کے بعد وتد از روئے معاقبہ ہوگا ورنہ وہ وزن رباعی کا وزن نہیں ہوگا۔

رودکی کے ایجاد کردہ اوزان کو دیکھ کر سب سے پہلے علامہ سحر عشق آبادی کو یہ احساس ہوا کہ حشو میں مقبوض رکن مفاعلن پر تو معاقبہ کا عمل کیا گیا ہے اور اس کے تحت مفاعلن کی جگہ مکفوف رکن مفاعیلُ رکھا گیا ہے لیکن حشو دوم پر معاقبہ کا عمل نہیں کیا گیا ہے اور ایسا نہ کرنے کا کوئی معقول جواز بھی نہیں ہے۔ مفاعلن (مقبوض) اور مفاعیلُ (مکفوف) دونوں عام زحافات کا نتیجہ ہیں۔ لہٰذا علامہ نے دو مزید رباعی کے اوزان اس طرح قائم کئے:

بنیادی اوزان

۱	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعلن	فَعَلْ/فعولُ
۲	مفعولُ	مفاعلن	مفاعلن	فَعَلْ/فعولُ

ان دو بنیادی اوزان (عروض وضرب کو الگ الگ شمار کریں تو چار بنیادی اوزان) پر عمل تخنیق سے مزید بارہ اوزان حاصل کئے جا سکتے ہیں جنکی تفصیل حسب ذیل ہے:

پہلے بنیادی وزن پر عمل تخنیق سے حاصل ہونے والے آٹھ اوزان اس طرح ہیں:

(۹) • ادبی نشیمن ــ

۱۔	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعلن	فَعَلْ
	اخرب	مکفوف	مقبوض	مجبوب
۲۔	مفعولن	مفعولُ	مفاعلن	فَعَلْ
	اخرب	مکفوف مخنق	مقبوض	مجبوب
۳۔	مفعولُ	مفاعیلن	فاعلن	فَعَلْ
	اخرب	مکفوف	مقبوض مخنق	مجبوب
۴۔	مفعولن	مفعولن	فاعلن	فَعَلْ
	اخرب	مکفوف مخنق	مقبوض مخنق	مجبوب

اور اسی طرح:

۵۔	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعلن	فعولْ
	اخرب	مکفوف	مقبوض	اہتم
۶۔	مفعولن	مفعولُ	مفاعلن	فعولْ
	اخرب	مکفوف مخنق	مقبوض	اہتم
۷۔	مفعولُ	مفاعیلن	فاعلن	فعولْ
	اخرب	مکفوف	مقبوض مخنق	اہتم
۸۔	مفعولن	مفعولن	فاعلن	فعولْ
	اخرب	مکفوف مخنق	مقبوض مخنق	اہتم

دوسرے بنیادی وزن پر تخنیق کے عمل سے حاصل ہونے والے چار اوزان اس طرح ہیں:

۱۔	مفعولُ	مفاعلن	مفاعلن	فَعَلْ
	اخرب	مقبوض	مقبوض	مجبوب
۲۔	مفعولن	فاعلن	مفاعلن	فَعَلْ
	اخرب	مقبوض مخنق	مقبوض	مجبوب
۳۔	مفعولُ	مفاعلن	مفاعلن	فعولْ
	اخرب	مقبوض	مقبوض	اہتم
۴۔	مفعولن	فاعلن	مفاعلن	فعولْ
	اخرب	مقبوض مخنق	مقبوض	اہتم

اس طرح رباعی کے اوزان کی مجموعی تعداد چھتیس (۳۶=۱۲+۲۴) ہوجاتی ہے۔ رباعی میں ان تمام اوزان کا خلط آئین عروض کے عین مطابق ہے۔

علامؔ کے بعد زارؔ علامی نے رباعی کے اس چھتیس اوزان میں مزید اٹھارہ اوزان کا اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے رکن مفعولُ (اخرب) کی جگہ فاعلن (اشتر) رکھنے کی سفارش کرکے مزید اٹھارہ اوزان کا اضافہ کرکے کل رباعی کے اوزان کی تعداد چوّن بتائی ہے۔ لیکن یہ کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ رباعی کا رکن اول (صدر وابتدا) ہمیشہ اخرب ہی ہوتا ہے۔ اس کی جگہ رکن اشتر لانا کسی طرح درست نہیں۔ زحاف شتر کا استعمال رباعی میں ممکن ہی نہیں۔

جیسا کہ اوپر مذکور ہے کہ ان تمام چھتیس اوزان کا خلط رباعی میں جائز ہے۔ یعنی رباعی کے چاروں مصرعے کسی ایک یا زیادہ سے زیادہ چار مختلف اوزان میں ہوسکتے ہیں۔ شمس الدین فقیرؔ اور عارف حسنؔ خاں نے اپنی چھے رباعیوں اور شمس الرحمن فاروقی نے اپنی نو رباعیوں میں رودکیؔ کے تمام اوزان یعنی چوبیس اوزان کو سمو دیا ہے۔

ان تمام چھتیس اوزان کو قارئین کے لئے یاد رکھنا بہت مشکل کام ہے لیکن اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ قارئین اگر چند بنیادی باتیں یاد رکھیں تو اس وزن میں ان سے غلطی ہونے کے امکانات بہت کم ہوں گے:

۱۔ رباعی میں کل مصرعوں کی تعداد چار ہوتی ہے۔ یعنی رباعی کی بحر ہمیشہ مثمن ہوگی مسدس یا مربع نہیں۔

۲۔ رباعی کا ہر ایک مصرع چار ارکان پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر مصرعے میں ماترائیں بیس ہوں گی یا اکیس۔ نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم۔

۳۔ رباعی کے ہر وزن کے صدر وابتدا میں یا تو مفعولُ آئیگا یا مفعولن۔

۴۔ رباعی کے عروض وضرب میں ہمیشہ فَعْ، فَاْعْ، فَعَلْ اور فعولْ میں سے ہی کوئی آئے گا۔

۵۔ عروض وضرب میں اگر فَعْ یا فَعَلْ ہے تو ماترائیں بیس ہوں گیں اور اگر فَاْعْ یا فعولْ ہے تو اکیس۔

۶۔ رباعی کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ اگر رکن کا آخری جز سبب ہے تو اس کے بعد آنے والے رکن کا پہلا جز بھی سبب ہوگا اور اگر رکن کا آخری جز وتد ہے تو آنے والے رکن کا پہلا جز بھی وتد ہوگا۔ وہ وتد مجموع بھی ہوسکتا ہے اور وتد مفروق بھی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ صرف وتد ہونا چاہئے۔ رباعی کی چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔

۱۔ رباعی از سوداؔ (رودکیؔ کے اوزان میں)

ایوانِ عدالت میں تمھارے اللہ　　کیا ظلم کو ہے دخل عیاذاً باللہ
شیشے کا جو واں طاق سے رپٹے ہے پاؤں　　پتھر سے نکلتی ہے صدا بسم اللہ

اِیْوَانِ/عَدَالْتْ مِ/تُمَارِیْ اَلْ/لَاہْ		کَاظُلْمَ/کِیْ دَخْلَ/عَیَاذَنْ بِلْ/لَاہْ

مفعولُ/ مفاعیلُ/ مفاعیلن/ فاعْ		مفعولُ/ مفاعیلُ/ مفاعیلن/ فاعْ
شِیْشِیْ کَ /جُوْ اُطَاق / سِ رَ پٹی ہَیْ /پاؤ		پُتّر سِ / نِکلتی ہَ / صدا اُسمِلن/لَاہ
مفعولُ/ مفاعیلُ/ مفاعیلن/ فاعْ		مفعولُ/ مفاعیلُ/ مفاعیلن/ فاعْ

۲۔ رباعی از عارفؔ حسن خاں (علامؔ کے اوزان میں)

کچھ کر تو ایسا جس کی نہ ہو مثال — دنیا کہے سب یہی ترا یہ ہے کمال
ہوگی تری فتح رکھ یقیں یہ دل میں تو — لگ جا ہمت تو کر ارے سپر نہ ڈال

گچ کَرْ تُوْ / اَیسا جِس / کی نَہُوْ /مِثال		دُنیا کَ/ہِ سَبْ یَہی /ترا ای ہَیْ / کَمال
مفعولن/مفعولن/ فاعلن/فعولْ		مفعولُ/ مفاعلن/ مفاعلن/فعولْ
ہُوْ گی تِ /رِ فتح رُک /یقیں دِل /مِیں تُوْ		لگ جا ہِمّ /مَت تکّر /اَرے سپر/ نَڈ اَل
مفعولُ/ مفاعلن/ مفاعلن/فَعَلْ		مفعولن/ فاعلن/ مفاعلن/فعولْ

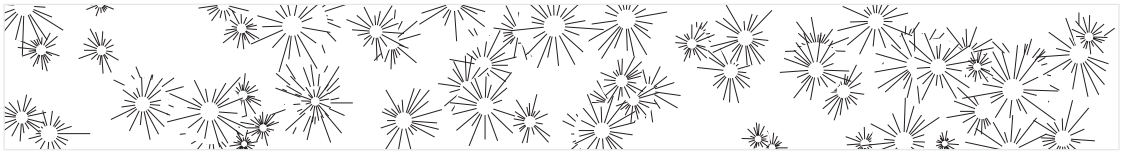
۳۔ رباعی از عارفؔ حسن خاں (رودکیؔ اور علامؔ کے خلط اوزان میں)

ہے میرؔ حقیقت میں شاعروں کا میر — ہو شاہ سخن کا، یا پھر کوئی فقیر
جس نے بھی پڑھا میرؔ کو دل سے اک بار — تا زیست رہا عارفؔ وہ اس کا اسیر

ہَیْ مِیر/حَقِیقَت مِیْ/شَاعِرُوْ/کَ مِیر		ہُوْ شَاہَ/سُخَنْ کَا یَا/پِرْ کُوْءِ/فَقِیر
مفعولُ/ مفاعیلن/ فاعلن/فعولْ		مفعولُ/ مفاعیلن/مفعولُ/فعولْ
جِسنِیْ ب/پڑھا مِیر/کَدِلْ سِیْ اِکْ/بَارْ		تا زِیس/رَہَا عَارِف/وَہْ اِسْکَ/اَسِیر
مفعولُ/ مفاعیلُ/ مفاعیلن/ فاعْ		مفعولُ/ مفاعیلن/مفعولُ/فعولْ

اس رباعی کا پہلا مصرع علامؔ کے وزن میں ہے جبکہ باقی مصرعوں کے اوزان رودکیؔ کے اوزان میں ہیں۔

☆☆☆



مطالعہ ولی کا تنقیدی تجزیہ

پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی
(شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد Mob. 9032520784)

ہماری اردو شاعری میں واعظ، ناصح اور شیخ کو بہت یاد کیا گیا ہے اور یہ یاد کرنے والے اپنے کو عاشق کہتے ہیں مگر ہیں شارب، شاید ہی کسی نے اپنے کو شارب کہا ہو، مے خانہ، جام اور ساقی سب موجود ہے مگر شاعر جو شارب ہے، وہ عاشق کے روپ میں ہے۔ میرا عاشق وہ شارب ہے جس نے مے خانہ میں پینے پلانے کا کام نہیں کیا بلکہ درس گاہ میں خود ساقی بن کر ہزاروں تشنگانِ علوم کو علوم کے جام پلائے کیوں کہ وہ خود علم کا دریا ہے، نہیں، بلکہ علم کے دریا کو پی کر شارب بن گیا۔ ایسا دریا جس پر رنگ و بو موجود ہے۔ تخلیق کی تازگی، تنقید کی شفافیت اور تحقیق کے موتی وغیرہ سب کچھ ہے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے میں کس شارب کی بات کر رہا ہوں، استاذ الاساتذہ پروفیسر شارب ردولوی اردو ادب و تنقید کے میدان میں تقریباً چھ سات دہائیوں سے جو خدمات انجام دے رہے ہیں وہ جگ ظاہر ہے۔ استاد محترم کی مختلف موضوعات پر درجنوں کتابیں ہیں جس کی افادیت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ بعض کتابوں کے آٹھ آٹھ ایڈیشن منظر عام پر آ چکے ہیں۔

پروفیسر شارب ردولوی عبقری شخصیت کے مالک ہیں مگر ان کی شناخت ایک تنقید نگار کی حیثیت سے زیادہ ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ تنقید کے علاوہ تحقیق و تدوین سے مناسبت کا اندازہ ''مطالعہ ولی'' سے لگایا جا سکتا ہے۔ نصف صدی قبل جنوری 1972ء میں اس کا پہلا ایڈیشن نصرت پبلیشر لکھنؤ نے شائع کیا تھا۔ اس میں انھوں نے ولی کے منتخب کلام کو تدوین کے اصولوں پر نہ صرف مرتب کیا ہے بلکہ 1972ء کی اس کتاب کے 72 صفحات پر ولی کے حالاتِ زندگی فکر و فن، زبان و بیان، شعری محاسن اور دکن کے پس منظر پر جو تحقیق ہے وہ ان کے محقق ہونے پر دال ہے۔

اردو شاعری میں ولی دکنی کی حیثیت تاریخ ساز ہے۔ ان کے حالاتِ زندگی، نام، ولادت اور وطن وغیرہ آج بھی موضوع بحث ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے محققین کی مختلف آرا کو نقل کرتے ہوئے مختصر مگر جامع انداز میں اپنی بات رکھی ہے۔ ولی کا نام کئی طرح سے لکھا گیا ہے مثلاً شاہ محمد ولی اللہ، شاہ ولی اللہ، محمد ولی اللہ، ولی محمد، محمد ولی اور شمس ولی اللہ وغیرہ، مولانا محمد حسین آزاد، فتح علی گردیزی، شفیق اورنگ آبادی، میر حسن، مرزا علی لطف، نصیر الدین ہاشمی، نور الحسن ہاشمی اور ظہیر الدین مدنی کی تحقیق کو مدِ نظر رکھ کر شارب ردولوی رقم طراز ہیں:

''تحقیقات کی روشنی میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ولی کا نام ولی محمد یا محمد ولی اللہ تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا نام دونوں طرح سے لیا جاتا رہا ہو، بہر حال ولی ان کی شناخت اور شہرت کا سبب بنا'' 1

ولی کے سنِ ولادت کا قطعی علم نہیں البتہ ظہیر الدین مدنی نے اندازہ سے ایک بات کہی ہے کہ ولی کا زمانۂ ولادت 1649ء سے قبل کا ہے کیوں کہ ان کے والد شریف محمد نے 1661ء میں وفات پائی، پروفیسر شارب ردولوی نے بھی ان کی اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ:

''ان کے والد کی تاریخِ وفات کے پیشِ نظر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ۴۹-۱۶۴۸ میں ولی کی ولادت ہوئی ہوگی'' 2

ولیؔ کے وطن کے سلسلہ میں دلچسپ اختلاف پایا جاتا ہے۔ ولی دکنی ہیں یا اورنگ آبادی یا پھر ولی گجراتی۔ ولی نے گجرات میں اچھا خاصا وقت گذارا۔ اورنگ آباد سے بھی ان کا تعلق تھا جو کہ دکن کا ہی حصہ رہا ہے۔ ولی نے گجرات کی تعریف میں کچھ اشعار کہے ہیں، اس لئے کچھ محققین نے یہ مان لیا کہ وہ گجرات کے ہیں۔ ولی نے ایک شعر میں خود کو دکن سے منسوب کیا ہے:

ولی ایران و توران میں ہے مشہور
اگر چہ شاعرِ ملک دکن ہے

اسی لئے شاید میر نے بھی کہہ دیا:

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

نصیر الدین ہاشمی، محی الدین قادری زور اور نور الحسن ہاشمی وغیرہ انھیں اورنگ آبادی مانتے ہیں، رام بابو سکسینہ اور احسن مارہروی نے دکنی کہا ہے۔ کئی تذکرہ نگاروں جیسے خواجہ خان حمید اورنگ آبادی، شیخ قائم الدین قائم، میر حسن اور نواب ابراہیم خاں وغیرہ نے ولی کو گجراتی یا احمد آبادی کہا ہے۔ آکسفورڈ کیٹلاگ میں بھی انھیں گجراتی بتایا گیا ہے۔ اس الجھن میں ڈالنے والی بحث کے پیشِ نظر مطالعہ ولی میں پروفیسر شارب ردولوی نے احسن طریقے سے بحث کو جو سمیٹا ہے، وہ قابلِ تعریف اور اتفاق رائے کا درجہ رکھتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''ولی کے وطن کے بحث نے کافی طول کھینچا۔۔۔ وطن کے بارے میں اس زمانے کے محققین کی بحث زیادہ تر ان کے علاقہ پرستی کی نشان دہی کرتی ہے اور اسے طول دینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس بحث میں جس طرح کے شواہد پیش کیے گئے ہیں، ان میں بھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، کسی شہر پر کوئی قطعہ یا کسی جگہ کی تعریف میں کوئی شعر وطن کا یقین کرنے لے لئے کافی نہیں۔ بہت سے شعراء نے مختلف مقامات کے بارے میں بڑے جذبات انگیز اشعار کہے ہیں گو کہ وہ ان کا وطن نہیں تھا۔ غالب جب کلکتہ کا ذکر کرتے ہیں تو ہائے ہائے کہہ اُٹھتے ہیں۔ اسی طرح یہ فیصلہ الفاظ و محاورات کی بنیاد پر قطعی طور پر نہیں ہوسکتا۔ یہ چیزیں کسی فیصلے پر پہنچنے میں معاون ہوسکتی ہیں۔ لیکن اس کی بنیاد نہیں بن سکتیں۔ جہاں تک جغرافیائی حد بندی کا تعلق ہے، اس وقت گجرات و دکن کی اس طرح تقسیم نہیں تھی جیسی آج ہے۔ اُس زمانے میں گجرات اور احمد آباد کو بھی دکن میں شمار کیا جاتا تھا ۔۔۔۔۔ (شجرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ) ان کے والدین گجرات کے رہنے والے تھے۔ لیکن ولی کی عمر کا زیادہ حصہ گجرات سے باہر اور دکن میں گذرا اس طرح دونوں جگہوں کی اہمیت وطن جیسی ہو جاتی ہے۔ ایک کو آپ اصل وطن اور ایک کو وطن مالوف کہہ سکتے ہیں'' 3

یہاں پروفیسر شارب ردولوی نے معتدل اور مدلل انداز میں جو فیصلہ کن بات کہی ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس نے وطن کے سلسلہ کی تمام بحث کو انجام تک پہنچا دیا۔ انھوں نے جانچنے کا جو اصول بتا دیا کہ عصبیت، علاقہ پرستی، لسانی اثرات یا تعریف و توصیف کے اشعار وغیرہ دلیل کے طور پر کسی بات کو ثابت کرنے یا منطقی نتیجہ تک پہنچنے کی بنیاد نہیں بن سکتے صحت مند تحقیق کے لئے ان باتوں کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

ولی کی تاریخ وفات کے بارے میں

اختلاف تھا مگر اب تحقیق سے ثابت ہو چکا کہ 1707ء میں وفات ہوئی حالات زندگی بیان کرنے کے بعد ولی کے سیاسی وتہذیبی پس منظر میں عادل شاہی وقطب شاہی سلطنت کی سرپرستی میں اردو کا جو فروغ ہوا اس کا اجمالی مگر مکمل جائزہ شارب ردولوی نے لیا ہے۔ دکن کی دونوں سلطنتوں کی خوبی یہ رہی ہے کہ بادشاہوں نے نہ صرف اُدبا، شعرا کی سرپرستی کی بلکہ ان میں بیشتر خود بھی ادیب و شاعر تھے۔ جن میں علی عادل شاہ ثانی اور قلی قطب شاہ کا نام قابل ذکر ہے۔ اس دور میں بڑی تعداد میں مثنویاں لکھی گئیں، ان مثنویوں نے اپنے اندر تمام تہذیبی عناصر کو سمیٹ لیا ہے، اسی تہذیبی پس منظر میں شارب ردولوی نے ولی کا مطالعہ کیا ہے۔ دراصل ولی نے ان دونوں مراکز کے اثرات کو قبول کیا عزیز و اقارب کی وجہ سے ولی کی آمد و رفت کا سلسلہ بیجاپور اور گولکنڈہ میں رہتا تھا۔ ولی کے کلام میں ایسی غزلیں ملتی ہیں جو انھوں نے عادل شاہی اور قطب شاہی شعرا کی زمینوں میں کہی ہیں شارب ردولوی کا کہنا ہے:

''ولی کی شاعری بیجا پور اور گولکنڈہ کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی ماحول میں پروان چڑھی اور ولی نے ایک عظیم ادبی و تہذیبی وراثت اپنے حصہ میں پائی جو دکن میں ولی سے بہت پہلے اعتبار حاصل کر چکی تھی۔''4

کلاسیکی دور کی اردو شاعری اور تصوف کو علیحدہ کرنا محال ہے۔ تصوف کا گہرا رنگ اردو شاعری کی تمام اصناف میں پایا ہے۔ دکن کے پس منظر کے بعد شارب ردولوی نے ولی کی صوفیانہ شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے تین اسباب بتائے ہیں۔ اول یہ کہ اردو زبان وادب کے ارتقا میں صوفائے کرام کا بڑا حصہ تھا۔ دوسرے اردو شاعری فارسی سے براہِ راست متاثر رہی تیسرے ہندوستانی مزاج، جہاں تصوف کی بڑی اہمیت تھی۔ تصوف ادب اور زندگی میں کب داخل ہوتا ہے یہ جاننا بھی ضروری ہے۔ دراصل جب سماج کشمکش، معاشی بدحالی، معاشرتی الجھن، سیاسی تصادم و عدم استحکام اور مستقبل کی غیر یقینی صورت حال پیدا ہو جائے تو انسان تصوف کی پناہ میں چلا جاتا ہے۔ اس لئے تصوف کو زندگی کے حقائق اور مسائل سے فرار کا راستہ قرار دیا گیا۔ اس تناظر میں ہم دیکھیں تو ولی کا زمانہ بھی اسی صورت حال کی نمائندگی کرتا ہے۔ لہذا ولی کا کلام تصوف سے کہاں بچ سکتا تھا پھر یہ کہ ولی خود بھی صوفی تھے۔ احمد آباد میں شاہ نور الدین سے درس سلوک حاصل کیا تھا۔ ولی کے استاد شاہ گلشن بھی ایک صوفی بزرگ تھے۔

تصوف میں عشق کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کی تعلیمات اور فکر میں عشق ہی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس جذبے کے بغیر سلوک کے منازل طے نہیں ہو سکتے۔ ولی کی نگاہ میں عشق کو برتنا اور سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ عشق کیا ہے ولی کا کہنا ہے کہ یہ صرف عارف جانتے ہیں:

عارفاں پر ہمیشہ روشن ہے
کہ فنِ عاشقی عجب فن ہے

یہاں ولی نے عشق کو فن قرار دیا ہے۔ پھر اس کا جاننے والا صرف عارف ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ محبوبِ حقیقی تک عشق کے ذریعہ ہی پہنچا جا سکتا ہے۔ یہ ایسی آگ ہے جو ہر دل میں موجود ہے فقیر ہو کہ بادشاہ امیر ہو یا غریب۔

عشق کے ہاتھ سوں ہوئے دل ریش
جگ میں کیا بادشاہ کیا درویش

حاجت نہیں چراغ کی تجھ گھر میں اے ولی
روشن ہے بزم عشق تری شمع آہ سوں

وہ صنم جب سوں بسا دیدۂ حیران میں آ
آتش عشق پڑی عقل کے سامان میں آ

تصوف کے ساتھ عشق اور عشق کے ساتھ حسن کا معاملہ لاینحل ہے۔ عشق کے بارے میں ولی کا کیا تصور ہے ہم نے ابھی دیکھا اب حسن کے بارے میں وہ کیا کہتے ہیں۔ پروفیسر شارب ردولوی سے معلوم کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیے:

''ولی کے یہاں عشق حقیقی و عشق مجازی کی طرح حسن کے بھی دو تصور ملتے ہیں ایک تو تجسیمی تصور ہے جس میں حسن ایک عام محبوب ہے جہاں وہ صرف اس کے قد و زلف و رخسار کی تعریف کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں اور ایک دوسرا تصور تنزیہی ہے جس میں حسن ایک حقیقت کی شکل میں ہے جس کا جلوہ عالم

کی ہر چیز میں ہے۔'' 5

حسن کا یہ دوسرا تصور ہی ولی کے یہاں اہم ہے۔ اس حسن کا پرتو خود ولی میں ہے جس میں جل جانے کو وہ عرفان سمجھتے ہیں:

بغیر از دیدہ حیران نہیں جگ میں نقاب اس کا
عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسنِ بے حجاب اس کا

ہر خوب رو کے حسن کے جلوے سوں بے پروا ہوا
تجھ حُسن عالم تاب کا جو عاشق شیدا ہوا

ولی نے اپنے کلام میں تصوف سے متعلق اور بھی معتدد مسائل بیان کیے ہیں مثلاً وحدت الوجود، فنا و بقا، معرفت اور وحدانیت وغیرہ۔ مگر ان کے یہاں فلسفیانہ گہرائی نہیں ہے اگرچہ بڑی خوبی سے تصوف کے مسائل کو اشعار کا جامہ پہنایا ہے۔

موضوعات کے بعد پروفیسر شارب ردولوی نے ولی کے فن کی طرف مراجعت کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو شاعری میں ولی نے اپنی جو تاریخ رقم کی ہے اس کی بنا فن اور زبان ہے۔ ولی نے اپنی جدت طبع، کئی زبانوں اور بولیوں پر عبور نیز سیلانی طبعیت سے حاصل شدہ تجربات کی وجہ سے شاعری خصوصاً غزل کو ایسی زبان عطا کی کہ دکن و شمال کی دوری کو ختم کر دیا، بے گانگی کو انسیت میں بدل دیا:

جس کے لگیا ہے دل کے تئیں خوش شعر تجھ دیوان کا
دکھن میں تیرے شعر من شاقی ہوئے تیرے ولی

اور جب دکن سے شمال کی طرف دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں:

یہ ریختہ ولی کا جا کر اسے سناؤ
رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کے مانند

اور یہ کہ:

اثر ہے شعر میں تیرے شرابِ پرتگال کا
ولی تجھ شعر کو سن کر ہوئے ہیں مست اہل دل

گو تعلّی ہر شاعر کا پسندیدہ عمل ہے مگر ولی نے اپنے اشعار کی اثر پزیری کا جو دعویٰ کیا ہے اس میں وزن ہے۔ میر نے اعتراف کیا تھا کہ:

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

حاتم اور آبرو بھی ولی کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں چنانچہ شاہ حاتم کہتے ہیں:

حاتم یہ فن شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں
لیکن ولی ؔ ولی ہے جہاں میں سخن کے پہنچے

اور آبرو کا کہنا ہے:

آبرو شعر ہے تیرا اعجاز
پر ولی کا سخن قیامت ہے

ولی کے اتنے گہرے اثرات کا دکن میں، شمال میں ہر جگہ اعتراف کیا جا رہا ہے، آخر کیا وجہ ہے؟

پروفیسر شارب ردولوی نے بڑے خوبصورت انداز میں ولی کے فن کو اجاگر کیا ہے جو ان کی مقبولیت اور تتبع کا ذریعہ بنی۔ چنانچہ کہتے ہیں:

''ولی کے کلام کا حسن کسی ایک بات میں نہیں ہے۔ ان کے یہاں ذوق حسن، لطافت احساس، نازک خیالی، غنائیت اور موسیقیت کا ایسا سیلاب ہے۔ کلام میں ایسی روانی اور بیان میں ایسا والہانہ پن، موزونی، برجستگی اور بندش میں ایسی صفائی اور چستی ہے کہ جس کی مثال مشکل سے ملے گی۔'' 6

آگے رقم طراز ہیں:

''بیان کی ذرا سی کوتاہی اچھے سے اچھے موضوع کو مبتذل اور عامیانہ بنا دیتی ہے۔ شدتِ احساس کی معمولی سی کمی بڑے سے بڑے شاعر کے کلام کو بے کیف کر دیتی ہے۔ ولی نے ان ساری نزاکتوں کو سامنے رکھا ہے'' 7

ولی کے فن پر بات کرتے ہوئے دلچسپ موڑ اس وقت آتا ہے جب شارب ردولوی وزیر آغا کا تعاقب کرتے ہیں۔ در اصل وزیر آغا نے ولی کو بڑا بت پرست قرار دیا اور اسی بت پرستی نے انھیں سراپا نگار بنا دیا۔ شارب ردولوی اس کے جواب میں کیا کہتے ہیں۔ یہ جاننے سے پہلے وزیر آغا کا الزام انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ کریں:

''ہندوستانی کلچر نے جنگل کے اثرات کو ورثے کے طور پر حاصل کیا اور جنگل کی فضا بُت پرستی ہی کی محرک ہے۔ ولی کی غزل میں بت پرستی کا یہ انداز اس اعتبار سے بھی گیت کی فضا سے متعلق ہے کہ اس میں بہت سی ایسی علامت اور تلمیحات اُبھر آتی ہیں جو براہِ راست ہندوستان کی دھرتی سے متعلق ہیں۔'' 8

اب شارب ردولوی کو ملاحظہ کریں۔ اگرچہ اقتباس طویل ہے لیکن تفہیم کے لیے ضروری ہے:

''ولی شاعرانہ اصطلاح میں ''بت پرست'' بھی ہیں اور ''کافر'' بھی لیکن جس نفسیاتی توضیح کی بنا پر وزیر آغا نے انھیں بت پرست کہا ہے۔ اس میں بحث کی بہت زیادہ گنجائش ہے۔ انھوں نے یونگ کے نظریہ Archetype کو

ولی کے کلام پر Imprse کرنے کی کوشش کی ہے۔ یونگ کے نفسیاتی نظریئے کا یہ بڑا سطحی استعمال ہے۔ اس کے یہاں ''جنگل'' اور اس کی ''وراثت'' کے پیچھے پورا ایک فلسفہ ہے۔ اس صورت میں تو ہر شاعر اور فنکار کیا ہر فرد و بشر کے لئے (بلا قید ہندوستانی) یہ بات کہی جاسکتی ہے۔ جہاں تک گیت کی فضا کی بات ہے وہ گیت کی فضا نہیں ہندوستانی عنصر یا مقامیت ہے۔ شاعری یا فن کاری کو اس زمین سے الگ نہیں کیا جاسکتا جہاں وہ پیدا ہوئی ہے اور جو شاعری اپنی زمین سے الگ ہو جاتی ہے وہ اعلی درجہ کی شاعری نہیں رہتی۔ ولی یا دوسرے دکنی شعرا یہاں مقامی ندیوں یا مقامی علامات اور تلمیحات کا ذکر یا ہندوستان کے مقدس مقامات اور تہواروں کا بیان یا عورت کی طرف سے اظہار عشق اور سجن، پیا، سرجن اور پیتم جیسے الفاظ کا استعمال ولی اور اردو غزل کے اپنی سرزمین سے اس بنیادی رشتہ اور تعلق کو ظاہر کرتا ہے جو بعض خاص اثرات کے تحت بعد کو ختم ہو گیا۔ جس کے بعد زبان نے خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کی ہو لیکن اس کی معصومیت بدلے میں تصنع اور بناوٹ ملنے سے کوئی انکار نہیں کرسکتا'' 9

وزیر آغا کے ذریعہ ولی کی شاعری پر قائم کی گئی تثلیث یعنی بت پرستی جنگل اور گیت کو شارب ردولوی نے اتنی خوبصورتی سے توڑا ہے کہ ولی کی عظمت دوبالا ہو گئی۔ اسی پیرا گراف میں شارب ردولوی کا تنقیدی نظریہ بھی کھل کر سامنے آ گیا ہے کہ ادب، زندگی اور سماج کا ایک دوسرے سے کیا رشتہ ہے۔ یہ تینوں مل کر ہی ایک دوسرے کی تعمیر کرتے ہیں، رد کرتے ہیں، ردعمل بھی ہوتا ہے اور اب تو بات رد تشکیل تک جا پہنچی ہے۔ بہر حال شارب ردولوی نے ولی کی مزید چند خصوصیات کا ذکر کیا ہے مثلاً ان کی شاعری میں مریضانہ کیفیت کا نہ پایا جانا، جنازہ، گور و کفن اور میت جیسی اصطلاحوں کو ترک کرنا جو عموماً اردو غزل میں مستعمل تھیں۔ اسی طرح تشبیہات و استعارت کی ندرت، زبان و بیان، الفاظ و محاورات کی خصوصیات کو اجاگر کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں شارب ردولوی نے مطالعہ ولی میں مختصر مگر جامع طریقے سے ولی کو مکمل طور پر نہ صرف سمجھنے بلکہ سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس کا نام بھی انھوں نے خوب رکھا ہے کہ واقعی ولی کے مطالعہ کے لئے یہ کتاب بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ جو بھی ولی پر کام کرنا چاہتا ہے، اس کے لئے ''مطالعہ ولی'' کا مطالعہ ضروری ہے۔ میری تجویز ہے کہ اسے دوبارہ شائع ہونا چاہیے۔

حوالے:

1۔ شارب ردولوی، پروفیسر، مطالعہ ولی، نصرت پبلیشر لکھنؤ، جنوری 1972ء، ص 11

2۔ ایضاً، ص 13

3۔ ایضاً، ص 16-17

4۔ ایضاً، ص 30

5۔ ایضاً، ص 42

6۔ ایضاً، ص 53

7۔ ایضاً، ص 53

8۔ ایضاً، ص 54

9۔ ایضاً، ص 54-55

☆☆☆

غزل

ڈاکٹر آفتاب عرشیؔ

(ہنسور، امبیڈکر نگر، یوپی)

9347334855

جرم کیا تھا جو کیا اِن کے حوالے مجھ کو
ہجر کر ڈالے نہ برباد بچا لے مجھ کو

شہر میں اُس کی سخاوت کا بہت چرچا ہے
پھر کہو اُس سے کہیں خود میں بسا لے مجھ کو

وقت نے یوں بھی بدل ڈالا ہے تیور اپنا
راس آتے ہی نہیں دن کے اُجالے مجھ کو

مستند سمجھے زمانے میں جسے ہر عاشق
عشق کا ایسا حوالہ تُو بنا لے مجھ کو

دن کے ڈھلتے ہی یہی ہوتا ہے ہر روز یہاں
میرے ہی دل سے کوئی اب تو نکالے مجھ کو

زندگی تجھ کو سکھا دے گی ہنر جینے کا
پہلے ہونٹوں کے تبسم میں سجا لے مجھ کو

خود کو ہاتھوں میں ترے سونپ دیا ہوں عرشیؔ
جو بھی بن پائے وہی اب تو بنا لے مجھ کو

☆☆☆

ناصر کاظمی کے شعری اُفق

انس مسرور انصاری

سکراول، اردو بازار، ٹانڈہ، ضلع امبیڈکر نگر-224190 (یوپی) موبائل: 9453347784

معاصر اُردو شعر و ادب میں ایک بڑی بدعت یہ رائج ہوگئی ہے کہ ہمارے اصحابِ قلم جب کسی شاعر اور ادیب پر لکھتے ہیں تو اُسے ''صاحبِ طرز'' ثابت کرنے کی اپنی سی کوشش کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ خواہ ثابت نہ کر سکیں مگر اصرار جاری رہتا ہے۔ شاعر اور ادیب کو بعد میں پتا چلتا ہے کہ وہ ''صاحبِ طرز'' بھی ہے۔ ادب میں یہ ایک طرح کا فیشن سا چل نکلا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تمثیل کے بطور کسی شاعر یا ادیب کی لسانی و فکری خصوصیات کو آئینہ بردوش کیا جائے۔ اس کے لیے میں نے ناصر کاظمی کا انتخاب کیا ہے جو واقعتاً صاحبِ طرز شاعر ہے۔

ناصر کاظمی ۱۹۲۵ء میں 'انبالہ' میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد فوج میں ملازم تھے۔ ناصر کاظمی بچپن ہی سے حساس واقع ہوئے تھے۔ اُن کے مزاج میں لطافت بھی تھی اور نزاکت بھی۔ فطرت کی حسن کاریوں کے شیدائی، عشق کی بوالعجبیوں اور حسن کی فسوں طرازیوں کے اسیر ناصر کاظمی ابتدائی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ اپنے والد کے ہمراہ اپنے آس پاس کے حالات اور واقعات کا مشاہدہ و مطالعہ بھی کرتے رہے۔ ۱۹۴۷ء میں ۲۲/ سال کی عمر میں اپنے آبائی وطن انبالہ کو چھوڑ کر آگ اور خون کا دریا پار کرتے ہوئے پاکستان کو ہجرت کی تو کہا۔

انبالہ ایک شہر تھا ، سنتے ہیں اب بھی ہے
ہم ہیں اُسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی

میر تقی میرؔ نے جب دہلی سے اودھ (لکھنؤ) کی طرف ہجرت کی تھی تو کہا تھا (اور مضمون کی یہ مطابقت محض اتفاقیہ نہیں ہو سکتی)

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

ناصر کاظمی اپنے پہلے مجموعۂ کلام ''پہلی بارش'' میں لکھتے ہیں:

''شاعری اصل میں شروع میں نے اس لیے کی کہ مجھے یوں لگتا تھا کہ جو خوب صورت چیزیں میں فطرت میں دیکھتا ہوں وہ میرے بس میں نہیں آتیں اور نکل جاتی ہیں۔ وقت جو مر جاتا ہے وہ دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتا ہوں شاعری میں زندہ ہو سکتا ہے

(۱۸) ◆ ادبی نشیمن ـــ

اسی لیے شاعری شروع کی۔ میں تو موسیقی اور مصوری کو بھی اپنی روایت سمجھتا ہوں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ موسیقی اور مصوری انسانی تہذیب کے لاشعور میں محفوظ رہتی ہیں اور اُن کے شعور کا اظہار شاعری ہے۔ موسیقی اور مصوری شاعری کی آنکھیں ہوتی ہیں۔

ہم لکھنے والے مسافر ہیں، نامعلوم منزلوں کے، مگر ہر مسافر کی الگ الگ منزل ہے۔ہم تھوڑی دور ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں اور پگڈنڈی پر بچھڑ جاتے ہیں اور اکیلے رہ جاتے ہیں اور اُداسی ہماری ہم سفر بن جاتی ہے۔

آج ہم انسانی شعور کے ایک نئے موڑ پر کھڑے ہیں۔ ہمارے مسائل اگلے وقتوں کے لوگوں سے مختلف ہیں۔ آواز قوی ہو تو دور دور پہنچ جاتی ہے۔ نحیف ہو تو حلق سے باہر ہی نہیں نکل پاتی۔صرف پہنچنے کی بات نہیں ۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایک آواز ہزاروں کی آواز بن سکتی ہے یا نہیں۔

نالہ محفلیں برہم نہیں کرتا، نالہ آفریں پر جو بھی گذری ہو، اُس کی فریاد من کے سانچے میں ڈھل کر نغمہ نہیں بن سکتی تو محض چیخ و پکار ہے۔''

ناصر کاظمی کی پوری شاعری اُس کے انھیں شعری نظریات سے عبارت ہے۔کہیں چیخ و پکار نہیں۔گھن گرج نہیں۔دھیمی دھیمی نرم آنچ پر پکتی ہوئی، خوشبو بکھیرتی ہوئی ۔اُس البیلے شاعر کی شاعری میں جوش و خروش ہے نہ اُبال مگر تاثیر بلا کی ہے۔!

کہتے ہیں غزل قافیہ پیمائی ہے ناصرؔ یہ قافیہ پیمائی ذرا کر کے تو دیکھو

شعری مجموعے ''پہلی بارش، برگِ نے ،اعتبارِ نغمہ، اور ''دیوان'' شائع ہو کر نقوشِ دوام چھوڑ گئے۔ ناصر کاظمی کی رحلت پر احمد ندیم قاسمی نے اپنے ایک تاثراتی مضمون میں لکھا:

''ناصر کاظمی ایک اچھا غزل گو ہی نہیں تھا، ایک عظیم غزل گو تھا۔ ناصر کی جدّت غزل کی روایت سے ہی پھوٹی تھی۔اس لیے ناصر اور اُس کے قاری کے درمیان وہ فاصلہ کبھی حائل نہ ہوا جو آج کتنے ہی جدید شعراء اور اُن کے قارئین کے درمیان حائل ہے۔غزل کو اتنا سادہ رکھ کر اتنی دور کی اتنی گہرائی کی باتیں کہہ جانا اُردو کے جدید شعراء میں سے صرف ناصر کاظمی کا کام تھا۔یوں سمجھئے کہ ناصر کے یہاں مصحفی، غالب، مومن اور فراق کے اپنے اپنے منفرد حسنِ ادا ایک دوسرے میں گھل مل گئے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ غزل کی روایت کے اس احترام کے باوجود ناصر کا اپنا ایک اُسلوب ہے۔اور جدید غزل کے موجودہ رجحانات کے پیشِ نظر ناصر کا یہ اُسلوب ناقابلِ تقلید ہے۔''

(بحوالہ ''ناصر کاظمی کے سو شعر'' سیّد شہاب اشرف)

ڈھونڈیں گے لوگ مجھ کو ہر محفلِ سخن میں
ہر دور کی غزل میں میرا نشاں ملے گا

سینچی ہیں دل کے خون سے میں نے یہ کیاریاں
کس کی مجال میرا چمن مجھ سے چھین لے

یہی شعر ہیں مری سلطنت اِسی فن میں ہے مجھے عافیت
مرے کاسۂ شب و روز میں ترے کام کی کوئی شے نہیں

بعض ناقدین کا خیال ہے کہ ناصر کاظمی، فراقؔ کی شاعری سے اکتسابِ فیض کرتے ہوئے میر تقی میرؔ تک پہنچے لیکن یہ خیال اس لیے درست نہیں کہ ناصر کی شاعری میں فراقؔ کے اثرات معدوم ہیں۔فراقؔ نے میر تقی میرؔ کے انداز میں، انھیں کی زمینوں میں غزلیں کہیں لیکن ان میں میرؔ کا سا سوز و گداز نہیں۔ تڑپ نہیں۔فراقؔ کی شاعری میں میرؔ کے تقلیدی نشانات تو ملتے ہیں لیکن وہ بہت زیادہ روشن اور واضح نہیں ہیں۔

اب اکثر چپ چپ سے رہے ہیں یونہی کبھو لب کھو لیں ہیں
پہلے فراقؔ کو دیکھا ہوتا اب تو بہت کم بولیں ہیں

غم کا فسانہ سننے والو آخرِ شب آرام کرو
کل یہ کہانی پھر چھیڑیں گے ہم بھی ذرا اب سو لیں ہیں
(فراق گورکھپوری)

اپنی اسی غزل میں فراق کہتے ہیں ''ان غزلوں کے پردے میں تو میرؔ کی غزلیں بولیں ہیں۔''

بلاشبہ فراق کی شاعری کا ایک حصہ طرزِ میرؔ کے زیرِ اثر ہے تاہم رنگِ میرؔ کو ناصرؔ کاظمی نے جس طرح کامیابی سے برتا، اس طرح فراق نہیں برت سکے۔اس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ ناصرؔ، فراقؔ کے توسط سے میرؔ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی شاعری کو اظہارِ فکر کا مرکز بنایا۔

خدائے سخن میر تقی میرؔ نے اردو کے ہر عہدِ شاعری کو متاثر کیا ہے۔ ہر دور میں طرزِ میرؔ کے مقلّد پیدا ہوئے۔عصری اردو شاعری میں طرزِ میر کے نمائندہ شاعر کلیم عاجز کا مشہور شعر ہے۔

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

میر تقی میر پر ناصر کاظمی کی خصوصی توجہ کے تعلق سے مہتاب حیدر نقوی اپنے پی،

ایچ،ڈی کے مقالہ ''ناصر کاظمی کی شاعری کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:۔

''ناصر کاظمی کی شاعری کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص عہد کے خوشگوار غزل گو شاعر ہی نہیں بلکہ ایک عہد ساز شاعر ہیں۔ ناصر کاظمی عہد ساز شاعر اس معنیٰ میں ہیں کہ بعد کی شاعری پر ان کی غزل کے واضح اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ ناصر کاظمی اردو غزل کی روایت میں انحراف وانکار کی غزل لے کر آئے۔ یہ غزل فکری اور فنی دونوں سطحوں پر انحراف کی غزل تھی۔ فکری انحراف کی غزل اس لیے تھی کہ ان کی غزل کے موضوعات اپنے ماقبل کی غزل کے موضوعات سے یکسر مختلف اور نئے تھے اور فنی طور پر اظہار کے ان تمام وسائل سے گریز کرتی تھی جن کا استعمال اردو کی روایتی نیز بیسویں کے نصف اوّل کی غزل میں کیا گیا۔ ناصر کاظمی اردو کے پہلے غزل گو شاعر ہیں جن کی پوری شاعری میں تشبیہات کا استعمال نہیں کے برابر ہوا ہے۔ ان کی غزل استعارہ، علامت اور مختلف قسم کے پیکروں کے ذریعے اپنے خیال کا اظہار کرتی ہے۔

ناصر کاظمی کے بعد جدید شاعروں نے میرؔ کے بجائے غالبؔ کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا لیکن تجربہ پسندی کے علاوہ جدید شاعروں کے تمام بنیادی رویئے ناصرؔ کاظمی کی غزل کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں، خواہ وہ موضوعاتی سطح پر ہوں یا فنی سطح پر۔۔۔۔۔۔۔!'' (ص،۷)

نہایت سادہ اسلوب میں گہری معنویت، عصری تفکّر اور سوزِ دروں نے ناصر کاظمی کو صاحبِ طرز اور منفرد بنا دیا۔ اس نے اپنے عہدِ شاعری کو ہی نہیں متاثر کیا بلکہ اس کے موثرات کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ کسی شاعر کا اپنے لہجے کی دریافت اُس کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اور ناصر کاظمی نے اس کامیابی کو پالیا۔ مختلف تغیراتِ زمانہ کے باوجود اُس کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اُداسی بال کھولے سو رہی ہے

''ابنِ انشاء کے خطوط'' (مطبوعہ۔ سہ ماہی ''الفاظ'' علی گڑھ) میں خلیل الرحمن اعظمی نے لکھا ہے کہ ۱۹۵۵ء میں علی گڑھ سے ان کا مجموعۂ کلام ''کاغذی ہے پیرہن'' کراچی سے ابنِ انشاء کا ''چاند نگر'' اور لاہور سے ناصر کاظمی کا ''برگِ نی'' ایک ساتھ شائع ہوئے اور عصری اردو شاعری پر اثر انداز ہوئے۔ ان میں ابن انشاؔ اور ناصرؔ کاظمی پوری طرح طرزِ میرؔ کے اسیر تھے۔

ناصر کاظمی کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لاہور کے نوجوان شعراء اسی کے انداز میں شعر کہنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس طرح ناصر کاظمی کا ایک مکتبۂ شعر وسخن قائم ہوگیا۔ لگتا تھا کہ لاہور میں اب صرف ناصر کاظمی کی تقلید کی جائے گی۔ ناصر نے رنگِ میر میں اپنے رنگ کی آمیزش سے ایک ایسا جادو جگایا جس کی مثال نہ تھی۔''

(سہ ماہی ''الفاظ'' علیگڑھ۔ مدیر۔ ابوالکلام قاسمی)

تقسیمِ ہند کے بعد تبادلۂ آبادی، فسادات، وحشت وبربریت، جلتی اور سڑتی ہوئی انسانی لاشیں، خواتین کی آبروریزی وبے حرمتی، معصوم بچوں کا بے رحمانہ قتلِ عام، آگ اور خون کا دریا، ہجرت اور نہ جانے کیا کیا کچھ ناصر کاظمی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جھیلا تھا۔ بیدار ذہن اور حساس دل رکھنے والے ناصر کاظمی کے لیے یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت تھا۔ اتنے سارے مظالم اور جبر واستبداد پر تو روح تک چیخ اُٹھتی ہے۔ ناصر کے اندرون میں بھی کہرام برپا ہوا مگر اُس نے اپنی چیخ وپکار کو اپنے اندر دبالیا اور اُس کا دم گھٹتا رہا۔ اُس کا کمال یہ ہے کہ اُس نے اپنے نغموں کو چیخ وپکار نہیں بننے دیا۔ اُس نے ساری کریہہ تصویروں کو پیش منظر کیا لیکن اپنے مخصوص انداز میں۔ اُس کا لہجہ نرم ہے۔ آواز پُرکشش ہے۔ دامنِ زندگی کے سارے داغ دھبّوں کو ناصر کاظمی نے اپنی شاعری میں منعکس کیا۔

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے

کیا کہوں کس طرح سرِ بازار
عصمتوں کے دیے بجھائے گئے

کہیں آگ اور کہیں لاشوں کے انبار
بس ائے دورِ زماں دیکھا نہ جائے

بازار بند راستے سنسان بے چراغ
وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی

شفق ہو گئی دیوارِ خیال
کس قدر خون بہا ہے اب کے

کیا کہوں اب تمھیں خزاں والو
جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ

او میرے مصروف خدا
اپنی دنیا دیکھ ذرا

خاک اُڑاتے ہیں دن رات
میلوں پھیل گئے صحرا

دیتے ہیں سُراغ فصلِ گل کا
شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے

بہاریں لے کے آئے تھے جہاں تم
وہ گھر سنسان جنگل ہو گئے ہیں

جنھیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصر
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

زندگی جن کے تصور سے جلا پاتی تھی
ہائے کیا لوگ تھے جو دامِ اجل میں آئے

ناصر کاظمی کی شاعری کو رومانی اور عشقیہ شاعر سے بھی منسوب کیا جاتا ہے مگر اُس کی عشقیہ شاعری قدیم اساتذۂ شعروسخن کے علاوہ بیسویں صدی کے حسرت، جگر، اصغر اور فانیؔ کی عشقیہ شاعری سے بھی بالکل مختلف ہے۔ اُس کی غزلوں میں عاشق اور معشوق کا کردار روایتی غزل کا ہونے کے بجائے عام انسانی زندگی کے حقیقی تجربات کا حامل کردار ہے۔ زندگی کی تلخ سچائیوں سے اُس کا براہِ راست تعلق ہے۔

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا

دل کی کہانی کہتے کہتے
رات کا آنچل بھیگ رہا تھا

تیرے گھر کے دروازے پر
سورج ننگے پاؤں کھڑا تھا

وہم کی مکڑی نے چہرے پر
مایوسی کا جال بُنا تھا

ہر ادا آبِ رواں کی لہر ہے
جسم ہے یا چاندنی کا شہر ہے

دل تو میرا اُداس ہے ناصرؔ
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

اپنی دُھن میں رہتا ہوں
میں بھی تیرے جیسا ہوں

تُو جیون کی بھری گلی
میں جنگل کا رستہ ہوں

یاد ہے اب تک تجھ سے بچھڑنے کی وہ اندھیری شام مجھے
تُو خاموش کھڑا تھا لیکن باتیں کرتا تھا کاجل

شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

وقت اچھا بھی آئے گا ناصرؔ
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

جدا ہوئے ہیں بہت لوگ ایک تم بھی سہی
اب اتنی بات پہ کیا زندگی حرام کریں

تیرا رستہ تکتے تکتے
کھیت گگن کا سوکھ چلا ہے

کہیں ملا تو کسی دن منا ہی لیں گے اُسے
وہ زُود رنج سہی پھر بھی یار اپنا ہے

جب تیز ہوا چلتی ہے بستی میں سرِ شام
برساتی ہیں اطراف سے پتھر تری یادیں

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

کس کے جلوؤں کی دھوپ برسی ہے
آج تو شام بھی سحر سی ہے

ناصر کاظمی کی کئی فکری جہتیں ہیں مگر کسی بھی جہت میں اُس کا لہجہ نہیں بدلتا۔ اُس کے لہجے کی نرماہٹ کہیں مجروح نہیں ہوتی۔ اس سے اُس کے ضبط و تحمل کا بھی پتا چلتا ہے اور فن پر مضبوط گرفت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ ناصر نے زندگی کی تلخ ترین صداقتوں کا بیان بھی ایسے لہجے میں کیا ہے جو شبنمی نہیں تو آتشی بھی نہیں۔

صبح نکلے تھے فکرِ دنیا میں
خانہ برباد دن ڈھلے آئے

یہ نگری اندھیاری ہے
اس نگری سے جلدی بھاگ

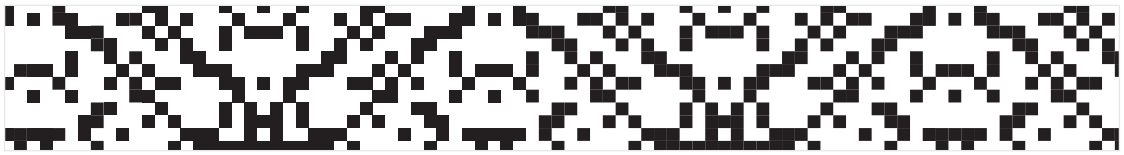
ہم اپنا غم بھول گئے
آج کسے دیکھا مجبور

کوشش لازم ہے پیارے
آگے جو رب کو منظور

ناصر کاظمی نے ۱۹۷۲ء میں صرف ۴۷/سال کی عمر میں زندگی سے منھ موڑ لیا۔ زندگی نے مزید وفا کی ہوتی تو اُردو شاعری کے دامن میں نہ جانے کیسے کیسے آب دار موتی ٹانکتا رہتا۔ فکر و فن کی کیسی کیسی بلندیوں کو چھوتا۔

کہیں کہیں کوئی روشنی ہے
جو آتے جاتے سے پوچھتی ہے
کہاں ہے وہ اجنبی مسافر
کہاں گیا وہ اُداس شاعر

☆☆☆



مرزا ہادی رسواؔ اور عبدالحلیم شررؔ لکھنوی کی ادبی رقابت

ڈاکٹر ناظم حسین خان
صدر شعبہ اردو، شیعہ پی۔جی۔کالج لکھنؤ موبائل:9415968215

مولانا عبدالحلیم شررؔ لکھنوی ان باکمالوں میں تھے جن کو نہ صرف لکھنوی ہونے کا شرف حاصل تھا بلکہ جو لکھنوی تہذیب وثقافت کے ساتھ اودھ کے شاہی دربار سے بھی وابستہ اور منسلک رہے تھے۔ان کے نانا صاحب مرحوم اس وفد کے ہمراہ لندن گئے تھے جو اودھ کی واگزاری کا مطالبہ کرنے ملکۂ انگلستان کی خدمت میں گیا تھا۔وہاں سے واپسی کے بعد وہ مٹیا برج کلکتہ میں بس گئے۔کچھ مدت کے بعد شرر مرحوم کے والد حکیم تفضّل مرحوم بھی جو مستند ادیب اور حاذق طبیب تھے اپنے ہونہار فرزند کو ہمراہ لے کر مٹیا برج چلے گئے۔اس وقت شرر مرحوم کی عمر تخمیناً نو برس کی تھی، اور تحصیل علوم کا کوئی باضابطہ سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ان کی صحیح معنوں میں تعلیم وتربیت کلکتے ہی میں ہوئی۔وہیں ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی اور رفتہ رفتہ علوم مشرقیہ میں کمال حاصل کیا۔کلکتے کے دوران قیام ہی میں جرنلزم سے بھی شوق ہوا اور اودھ اخبار لکھنؤ کے نامہ نگار کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔انیس برس کی عمر میں لکھنؤ واپس ہوئے اور منشی نول کشور نے اودھ اخبار کے اڈیٹوریل اسٹاف میں ان کو جگہ دے دی۔قریب قریب اسی زمانے میں ان کی شادی اپنی ماموں زاد بہن کے ساتھ ہوگئی۔اور غالباً اسی سال اودھ اخبار میں ان کا ایک مضمون ''روح'' کے عنوان کے تحت شائع ہوا۔یہ مضمون سرسید احمد خاں مرحوم کی نظر سے بھی گزرا، انہوں نے بہت پسند فرمایا اور اس کا ایک حصہ اخذ کر کے اپنی کسی تالیف میں شائع کرنے کی اجازت طلب فرمائی۔سرسید کی اس حوصلہ افزائی سے یا سسرال کے ماحول سے اتنا متاثر ہوئے کہ علم حدیث پڑھنے کا ذوق ہوا، لہٰذا دہلی چلے گئے اور مولوی محمد نظیر حسین محدث دہلوی کے درس میں شامل ہوگئے۔فارغ التحصیل ہو کر تھوڑی ہی مدت میں لکھنؤ واپس ہوئے اور اپنے نگارشات کا سلسلہ شروع کر دیا۔

شررؔ مرحوم کی ابتدائی کاوشوں میں ان کے ماہ ناموں، دلگداز اور مہذب کا اردو ادب میں بہت بلند مقام ہے۔ان کے ابتدائی ناول دلگداز ہی میں شائع ہوئے تھے۔ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ، ایسی معرکہ آراء تصنیف سب سے پہلے دلگداز ہی میں شائع ہوئی تھی۔مہذب میں جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے تہذیب واخلاق سے متعلق مضامین لکھتے رہے۔علمائے اسلام کی سوانح عمریاں اسی رسالے میں چھپتی تھیں جن کی غرض تعلیم اخلاق تھی۔لیکن یہ سلسلہ زیادہ مدت تک نہیں چل سکا۔دلگداز تو کئی مرتبہ نکلا اور بند ہوگیا، لیکن مہذب ۱۸۹۰ء میں بالکل بند ہوگیا۔اسی سال دونوں رسالوں کو بند کر کے شرر مرحوم حیدرآباد چلے گئے۔حیدرآباد کے دوران قیام کے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہو سکے، البتہ وہ خود یہ بیان فرماتے تھے کہ حیدرآباد کے جانے سے یہ فائدہ ہوا کہ ان کو لندن جانے کا موقع فراہم ہوگیا۔جہاں انہوں نے انگریزی زبان پر بہت اچھی اور فرانسیسی زبان پر اچھی دست گاہ حاصل کر لی۔حالانکہ لندن میں قیام کا وقفہ ۱۴ ماہ سے زیادہ کا نہیں تھا۔مولانا فرماتے تھے کہ وقار الامراء کے صاحب زادے نواب ولی الدین خاں ایٹن میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اور ان کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ مذہب سے بالکل بہرہ ہیں۔لہٰذا مولانا کو اس لئے بھیجا گیا تھا کہ وہ ان کو اسلام کی

تعلیم دیں۔ جب اس فریضے کو انجام دے چکے تو پھر حیدر آباد چلے آئے۔ یہاں سے پھر دلگداز جاری کیا۔لیکن نہ یہ ماہنامہ وہاں بہت دنوں تک چل سکا اور نہ وہ خود زیادہ مدت تک قیام فرما سکے۔

۱۹۰۱ء میں لکھنؤ آ کر متمکن ہو گئے، اور تھوڑی ہی مدت کے بعد پھر دلگداز جاری فرما دیا۔ جو فی الفور مقبول ہو گیا۔ مرزا صاحب کی نشست گاہ ایک علم وادب کا گہوارہ اور شرافت وتہذیب کی درسگاہ تھی، جہاں ہر حاضری کے موقع پر کچھ نہ کچھ فیض ضرور حاصل ہوتا تھا۔ مرزا صاحب کے پر خلوص اور بے تکلف دوستوں میں شررؔ مرحوم بھی تھے، اور ان کو بھی مرزا صاحب کی ذات سے وابستگی تھی ان کا مکان بھی مرزا صاحب کے مکان سے قریب ہی محلہ کٹرہ بزن بیگ میں تھا۔

اس لئے یہ دونوں بزرگ برابر ایک دوسرے سے ملاقاتی ہوتے تھے اور چونکہ مرزا صاحب کے یہاں اور دوسرے ادیب وشعراء جمع ہوا کرتے تھے، اس لئے شررؔ صاحب بھی وہیں تشریف لے آیا کرتے تھے، یہ صحبتیں ایسے مواقع پر بے حد دلچسپ اور دل نواز ہوتی تھیں جب مرزا ہادی رسوا بھی پہنچ جاتے تھے۔ دائرہ تہذیب میں مقید رہتے ہوئے بھی آزادانہ گفتگو ہوتی تھی، اور شائستگی وسنجیدگی کا پہلو لئے ہوئے طنز ومزاح بھی ہوا کرتے تھے۔ وہ مکالمے اب خواب وخیال ہیں۔

مرزا محمد ہادی رسوؔا اپنے اسلوب اور زبان کی خوبیوں کی وجہ سے بھی اردو ناول نگاری میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں، رسوؔا کی زبان ان کی ناولوں کی روح ہیں۔ اگر مرزا رسوؔا کی گرفت زبان و بیان پر نہ ہوتی تو وہ اپنے ناولوں کے موضوع کو اتنی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش نہ کرتے۔ رسوؔا کے انداز بیان کی بے ساختگی و دلکشی جادو کا اثر رکھتی ہے۔ رسوؔا ہر پیشہ اور ہر طبقہ کی گفتگو اور محاورات بڑے فطری انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ ان کی زبان دانی کا کمال ان کے مکالموں میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ان کے مکالمے ایک طرف کرداروں کی فطرت کی عکاسی کرتے ہیں تو دوسرے طرف ان سے کہیں کہیں ڈرامائی شان بھی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے مکالمے مختصر ہوتے ہیں لیکن اپنے اندر بلا کی تاثیر رکھتے ہیں۔

مرزا ہادی رسوؔا ۱۸۵۸ء کو لکھنؤ میں تولد ہوئے۔ گھر کے خوشحال تھے مگر کم عمری میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا اس وقت مرزا رسوؔا تقریباً سولہ ۱۶ برس کے تھے۔ مرزا ہادی رسوؔا کو دنیا کا تجربہ نہ تھا بزرگوں کی وراثت عزیزوں نے غصب کر لیا۔ لیکن رسوؔا نے ایسے عالم میں شکر خدا ادا کیا۔ مرزا رسوؔا محنت کش اور جفاکش انسان تھے رسوؔا کو علم نجوم اور علم ریاضی میں مہارت حاصل تھی اردو کے علاوہ رسوؔا کو دنیا کی مختلف زبانوں پر عبور تھا۔ رسوؔا کی دلچسپی ناول نگاری یا شاعری میں نہیں تھی بلکہ ان کو پوری توجہ علم کیمیا (Chamistry) پر تھی۔ رسوؔا کی زیادہ تر زندگی تحقیقات اور سائنس کے حصول میں گذری ہوا۔ لیکن جہاں صنعت اور حرفت میں اتنی دلچسپی تھی وہیں ان کو علم و ادب اور فنون لطیفہ میں بھی دلچسپی تھی۔ فنون لطیفہ میں شاعری، انشاء پردازی، ناول نویسی، موسیقی وغیرہ میں کمال حاصل تھا، مرزا ھادی رسوؔا نے ہی سب سے پہلے اردو شارٹ ہینڈ نکالا۔ علم فقہ سے ڈاکریٹ کی ڈگری حاصل کی اور پھر سائنس کی کتب کے تراجم کیلئے حیدر آباد چلے گئے۔ رسوؔا کے مزاج میں نہایت سنجیدگی اور متانت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ رسوؔا کے مشاہدات دیگر ناول نگاروں سے مختلف ہے۔ رسوؔا کو سائنسی علوم اور انسان کے دماغی ساخت سے واقفیت تھی۔ شائد اسی وجہ سے علمی تحقیق میں عمر گذرنے کی وجہ سے ان کا ذہن ایسا بیدار ہوا اور ان کا شعور اتنا تیز ہوا کہ باوجود اس کے کہ ان کا زمانہ اور ماحول ایک ایسے طرز کے ناول کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو غیبت یا مثالیت کو پیش نظر رکھے۔

☆☆☆

کچھ دیر ظفر اقبال ظفرؔ کے ساتھ

پروفیسر علیم اللہ حالیؔ (پٹنہ)

اردو زبان کے ذخیرۂ سخن میں غزل کی صنف سب سے مشہور اور مقبولِ عام وخاص ہے۔ اب آج نقشہ یہ ہے کہ غزل گو حضرات کا ایسا جمِ غفیر ہے کہ اس میں اپنی شناخت قائم رکھنا بے حد مشکل ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب تک فن کار بہتوں سے مختلف نہ ہو اس وقت تک اسے اپنا مقام بنانا آسان نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس بھیڑ میں اسی فن کار پر نظر رکتی ہے جس میں کوئی انفرادی خصوصیت ہو۔ جناب ظفر اقبال ظفرؔ کے سلسلے میں اپنے تاثرات رقم کرنے کی کوشش اور خواہش مصروفیات کی وجہ سے ٹلتی رہی تا آنکہ ان کا مجموعہ "نمودِ ہنر" شائع ہو کر لوگوں تک پہونچ بھی گیا۔ شہر یار، مظفر حنفی، شمس الرحمٰن فاروقی، حامدی کاشمیری اور عشرت ظفر اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ انھوں نے ظفر اقبال کی شاعری کے سلسلے میں اپنے تاثرات پیش کئے اور یہ تحریریں "نمودِ ہنر" میں محفوظ ہو گئیں۔ کسی مسودے پر لکھنے کا ارادہ ہو اور اس کا وقت گزر جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ مشتے باز از جنگ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ آج جناب ظفر اقبال ظفر پر قلم اُٹھایا ہے تو اپنی محرومی کا احساس ہوتا ہے۔

غزل گوئی جتنی آسان صنف ہے اسی قدر یہ دشوار بھی ہے۔ جہاں تک نئے موضوعات وخیالات اور عصری سیاسی وسماجی حالات کو جزوِ سخن بنانے کا مسئلہ ہے تو یہ حقیقت بھی سامنے رکھنی چاہئے کہ ہر شاعر اپنے اظہار میں کبھی شعوری طور پر اور کبھی اضطراری انداز میں اپنے عہد کا نقشہ اُتارتا ہے۔ اب کوئی ایسا موضوع نہیں رہا جو غزل کے حصار سے باہر ہو۔ اس لئے موضوعات کے تنوع اور عدم تنوع بھی موضوعِ سخن نہیں بنتے۔ اب محض ایک رنگِ سخن ہے جس سے تخلیق کار کی انفرادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ظفر اقبال ظفر کی شاعری پر قلم اُٹھاتے ہوئے مجھے یہ اطمینان ہے کہ میں اپنی تنقید اور اپنے تاثرات کو ایک ایسے شاعر سے منسوب کر رہا ہوں جو اپنے عہد میں ایک نمایاں اسلوب اور انفرادی لہجے کا حامل ہے۔ ظفر اقبال کی پہچان اس امر سے متعین ہوتی ہے وہ غزل کے اس رمز کو پہچانتے ہیں جس سے فن کار کے اختصاص اور امتیاز کی خوبیاں قائم ہوتی ہیں۔ غزل کا فن مکالمے اور مشاہدے کا فن ہے۔ لیکن یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اچھا غزل گو اپنی ذات اور اپنی داخلی شخصیت کو مخاطب بناتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ غزلیہ اشعار ہی وہ حربہ ہیں جن کے ذریعے اپنی شخصیت سے گزر کر تخلیق کار اپنے قاری کو قریب کرتا ہے۔

غزل کا شاعر صوفی اور جوگی ہوتا ہے جو خارجی دنیا کے ہنگاموں اور افراتفری سے لڑنے کے لئے ہمیں مہذب راستہ بتاتا ہے۔ انقلاب

(۲۴) ادبی نشیمن ـــ

اوراختلاف کے جذبے بھی غزلیہ اشعار میں نرم لب و لہجے کے ساتھ سامنے آتے ہیں ۔جہاں تک مسائلِ حیات سے نمٹنے اور ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کا مسئلہ ہے تو غزل کے اشعار بہت مثبت کردار ادا کرتے ہیں اور ایسے لہجے میں قاری کو متوجہ کرتے ہیں کہ اس کے اشعار ایک باشعور مہذب اور متین ذہن کی تعمیر کرتے جاتے ہیں۔ میں پھر کہوں گا کہ غزل کے اشعار مسائلِ حیات کو راست انداز میں پیش نہیں کرتے ۔موضوع کے خوشگوار فکری خطوط لفظ اور کیفیات سے گزرتے ہوئے معاشرے کو مثبت اقدار کی طرف لے جاتے ہیں ۔فراقؔ کے اس شعر پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ غزل کے شعر میں موضوع کیسے دبے پاؤں اپنی پہچان کراتا ہے:

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

غور کیجئے کہ موضوع کس طرح الفاظ کی رگوں میں اپنا ہیولیٰ تیار کرتا ہے ۔اسی طرح جگرؔ کا شعر ؎

کس کا خیال ، کون سی منزل نظر میں ہے
صدیاں گزر گئیں یہ زمانہ سفر میں ہے

ماورائی اور سمائی منزلوں سے گزر کر ایک خوش گوار موضوع کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ظفر اقبال ظفرؔ کے اشعار بھی اندرون کے مکالمے کی صورتِ حال پیدا کر کے ہمارے ذہن وروح کو بیدار کرتے ہیں۔ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

جانے کیا زہر ہے ہواؤں میں
اپنے اندر سمٹ گیا ہوں میں

ظفر اقبال ظفرؔ جانتے ہیں کہ زندگی کو معنویت عطا کرنے کے لئے تخلیق کار کو داخلی گہرائیوں میں اُترنا پڑتا ہے۔خود میں اُترنے کی بیکراں خواہشیں اور غیر مادی انبساب کی تلاش ظفر اقبال ظفر کے یہاں بدلتے ہوئے انداز میں نظر آتے ہیں ایک جگہ کہتے ہیں ؎

ہاتھ آیا نہیں گہر کوئی
میں نے تہ میں اُتر کے دیکھ لیا

یہ شعر بھی دیکھئے جس میں اپنی بصیرت پر تخلیق کار اطمینان کی سانس لیتا ہے۔ ؎

بصیرت کے عجب منظر کھلے ہیں
ہم اپنی ذات کے اندر کھلے ہیں

اختصار سے کام لیتے ہوئے غزل کے قارئین سے کہوں کہ ظفر اقبال ظفر کے یہاں فکر واحساس کے جو مثبت پہلو سامنے آئے ہیں اور جن سے ان کا امتیاز قائم ہوتا ہے اس سے مستفید ہوں اور ایک خوبصورت شعر سنئے: ؎

ہوجائے گی تعمیر عمارت بھی کسی دن
مانا کہ ابھی خواب کی بنیاد پڑی ہے

☆☆☆

دوہے

ڈاکٹر حبیب راحت حباب
(دارالسلام، گلشن نگر کھنڈوا۔ایم پی)
9977766628

سّناٹے بوٗ رائے سے ، باندھے پھریں لنگوٹ
سردی نکلی رات میں، پہنے شبنم کوٹ

گاؤں کی چوپال پر ، ٹھنڈے پڑے الاؤ
گُنتارے میں گُم ہیں سب، کِسے دِکھائیں گھاؤ

ہریا دُبکا سا پڑا ، کیسے کھولے بھید
من میں چنگاری دبی ، گُدڑی میں سوچھید

برفیلی رُت کا ذرا ، دیکھے کوئی کمال
ڈھکے بدن پر کُھل رہی ، پشمینے کی شال

ہوا پہ بندش ہی نہیں، ہوا کا ہے یہ حال
سب کے کان اَیٹھتی ، جینا کرے محال

شیت لہر چھوں اور سے ،حملے کرتی سخت
تِس پر ترساتا ہمیں ، سورج بھی کمبخت

گھوڑے کی تو چھوڑیئے،سوئے بیچ کر اونٹ
سُکھیا کو جب شیت میں،مل جائے دوگھونٹ

شال دوشالے چیز کیا ، کہاں کے ریشم اون
شیت لہر کے وار سے، جمے رگوں میں خون

مُکھیا کی چوپال پر ، مُجرا ، مُرغ ، شراب
شیت کال کا جشن ہے ، سمجھو ذرا حبّاب

سب کے نشے ہرن ہوئے،سب کے موڈ خراب
موسم آپے میں نہیں ، رہا حبیب حباب

☆☆☆

خان محبوب طرزی کی بازیافت: ڈاکٹر عمیر منظر کا نیا کارنامہ

منظور پروانہ
دانش محل، امین آباد، لکھنؤ۔226018 موبائل : 9452482159

ڈاکٹر عمیر منظر نام ہے اس شخصیت کا جو اپنے فرائض منصبی کو انجام دینے کے ساتھ ساتھ پوری یکسوئی اور تندہی کے ساتھ اپنے تخلیقی، تالیفی، تصنیفی اور تحقیقی کاموں میں لگے رہتے ہیں اور ادبی سمندر میں غوطے لگا کر ایسے موتی نکال کر لاتے ہیں کہ ادبی دنیا ان کی خداداد صلاحیتوں کی گرویدہ ہوتی چلی جارہی ہے۔اس کی تازہ مثال ہے ان کی نئی کتاب ''خان محبوب طرزی: لکھنؤ کا ایک مقبول ناول نگار'' اس وقت یہ کتاب میرے مطالعہ میں ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر عمیر منظر کی عمدہ ترتیب ہے۔ترتیب اس لئے کہ اس کتاب پر ان کا نام بحیثیت مرتب درج ہے مگر میری نظر میں یہ ایک تحقیقی کام ہے۔اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر تحقیق ہے کیا۔؟ دراصل تحقیق نام ہے ماضی کے گہرے سمندر میں ڈوب کر جواہر ریزے تلاش کرنا۔انھیں اپنے طور پر صاف کر چمکانا اور نئی نسلوں کے لئے ان کی افادیت کے تناظر میں جانچنا پرکھنا اور استدلال کے پیکر میں سجا کر دنیا کے سامنے رکھنے کا عمل۔ڈاکٹر عمیر منظر نے اسی راہ پر چل کر اپنی کتاب ''خان محبوب طرزی: لکھنؤ کا ایک مقبول ناول نگار'' کے ذریعہ خان محبوب طرزی کی بازیافت کا کارنامہ انجام دیا ہے۔

کوئی بھی دعویٰ اس وقت تک قابل قبول نہیں ہوتا جب تک اس کے حق میں مضبوط دلائل نہ ہوں۔لہٰذا صرف یہ کہہ دینے سے کہ ڈاکٹر عمیر منظر نے خان محبوب طرزی کی بازیافت کا کارنامہ انجام دیا ہے، بات نہیں بنتی۔لہٰذا میں اپنے اس دعوے کے حق میں اس کتاب میں شامل شمس الرحمن فاروقی کے مضمون ''خان محبوب طرزی'' سے دلیل پیش کررہا ہوں۔جس سے یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہ ہوگا کہ نئی نسل خان محبوب طرزی کے نام اور کام سے واقف نہیں ہے۔شمس الرحمن فاروقی اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''میں سمجھتا تھا کہ طرزی صاحب کو آج کوئی نہیں جانتا اور مجھے اس کا رنج بھی تھا کہ اس زمانے میں اردو نے کئی مقبول ناول نگار دنیا کو دیے: رئیس اختر ندوی، رئیس احمد جعفری، قیسی رامپوری، اے۔آر۔خاتون اور ان سے ذرا پہلے منشی فیاض علی اور ایم۔اسلم ان میں کوئی ایسا نہ تھا جو خان محبوب طرزی کی طرح کا ابداع اور تنوع رکھتا ہو۔''

اردو کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنانے والے خان محبوب طرزی کی اہمیت کیوں تھی اس طرف اشارہ کرتے ہوئے شمس الرحمن فاروقی تحریر فرماتے ہیں کہ ''اردو میں سائنس فکشن کا انہیں موجد کہا جاسکتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں خان محبوب طرزی جیسا سائنس فکشن اردو میں پھر نہ لکھا گیا۔اسرار اور مہم جوئی بھی ان کا ایک میدان تھا۔''

ایسے اہم ناول نگار کی بازیافت کیلئے شمس الرحمن فاروقی ڈاکٹر عمیر منظر کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ''ہم سب کو عمیر منظر کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ انھوں نے خان محبوب طرزی کی تحریروں کو یکجا کرنے اور شائع کرانے کا بیڑا اٹھایا۔اس طرح ماضی قریب کا ایک قیمتی سرمایہ محفوظ ہوگیا۔اور شاید اس طرح خان محبوب صاحب کے کارناموں سے دنیا دوبارہ واقف ہوسکے۔عمیر منظر نے یہ کام کئی برس کی تلاش اور محنت سے انجام دیا ہے۔ان کا دیباچہ بھی پڑھنے کے لائق ہے۔''

اب دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا ڈاکٹر عمیر منظر، خان محبوب طرزی کی شخصیت سے واقف تھے؟ اگر نہیں تو پھر انھوں نے اس کام کا بیڑا کیوں کر اٹھایا۔اس سلسلے میں ڈاکٹر عمیر منظر اپنے مضمون ''اظہار تشکر'' میں رقم طراز ہیں کہ ''خان محبوب طرزی کا ذکر پروفیسر عبدالرشید (شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے کیا تھا۔

طرزی کے بارے میں مجھے زیادہ معلومات نہیں تھی۔ پروفیسر عبدالرشید صاحب نے بتایا کہ یہ لکھنؤ کے بہت مقبول ناول نگار تھے۔ ان کو اب جاننے والے کم ہیں کوشش کریں کہ ان کے سلسلے میں کچھ کام ہو جائے۔ انھوں نے طرزی کے کچھ ناولوں کی نشاندہی بھی کی۔ میں کچھ دنوں تک اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ کیا کیا جائے پھر بہت سست رفتاری کے ساتھ کام شروع ہوا۔ ایک سال تک کوئی خاص کامیابی نہیں ملی۔ مگر اس کے بعد عبدالرشید صاحب نے طرزی کے متعدد، ناولوں کی نشاندہی کی۔ سچ یہ ہے کہ اس کتاب کی تیاری میں قدم قدم پر ان کی مدد اور رہنمائی شامل رہی ہے۔''

مندرجہ بالا عبارت سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ڈاکٹر عمیر منظر نے اس کام کو کس طرح اور کتنی محنت سے انجام دیا۔ اس کام کا انجام بخیر اس لئے ہوا کیونکہ ڈاکٹر عمیر منظر کی ذہنی وفکری استعداد وسیع ہے اور عمیق مطالعہ کے ساتھ نگاہ پارکھی ہے۔

شمس الرحمن فاروقی نے عمیر منظر کے جس دیباچہ کو پڑھنے کے لائق بتایا ہے۔ وہ دیباچہ ۵۲ صفحات پر محیط ہے۔ اور واقعی پڑھنے کے لائق ہے۔ وہ اس لئے کہ اگر قاری صرف اس دیباچہ کا ہی مطالعہ کر لے گا تو اسے خان محبوب طرزی کے سوانحی کوائف، حیات و جہات اور کارناموں، ان کے ناولوں کی موضوعات، ان کی اہمیت اور ان کی تعداد کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔ ثبوت کے طور پر ڈاکٹر عمیر منظر کے دیباچہ سے چند اقتباسات پیش ہیں:

☆ زمانے کے سرد وگرم سے بے نیاز ہو کر ادب کو اپنی روز مرہ زندگی کا حصہ بنانے والے طرزی نے زندگی کو خود گذارا نہیں بلکہ اس کو گذر جانے کا موقع دیا۔

☆ حفیظ نعمانی نے اپنے مضمون میں صرف یہ لکھا ہے کہ دو بیویوں سے سولہ اولاد تھی۔

☆ خان محبوب طرزی کو اگر چہ تعلیم کے بہتر مواقع نہیں مل سکے مگر انھوں نے اپنے ذوق مطالعہ کے بدولت بہت ترقی کی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی صلاحتیں نکھرتی چلی گئیں اور وہ ایک عظیم تخلیق کار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں روشناس ہوئے۔

☆ طرزی کی ادبی مصروفیات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ان کا شمار بسیار نویسوں میں ہوتا تھا۔

☆ طرزی کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی تھی کہ وہ بیک وقت کئی ناول لکھتے تھے۔

☆ نسیم بک ڈپو اور ادارہ فروغ اردو سے طرزی کے بہت سے ناول شائع ہوئے، لیکن مطالعۂ طرزی میں ایک اہم مسئلہ ان کی ناولوں کی تعداد کا تعین کا ہے۔ طرزی کے فکر وفن سے متعلق مضامین میں عام طور پر محض اندازے سے ان کے ناولوں کی تعداد لکھی گئی ہے۔

☆ اس دیباچہ میں مختلف لائبریریوں اور رسائل کے ساتھ اشاعتی اداروں کی فہرستوں اور طرزی کے بعض معاصرین کے مضامین کی مدد سے طرزی کے ناولوں کی تعداد متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن پھر بھی یہ تعداد حتمی نہیں ہے۔

☆ اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ طرزی کے ناولوں میں موضوعات کا بہت تنوع ہے عام طور پر ناول نگاروں نے تاریخی سماجی یا جاسوسی موضوعات میں سے کسی ایک موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ ایسے تخلیق کار کم ہیں جو بیک وقت کئی موضوعات پر لکھنے کی قدرت رکھتے ہوں۔ یہ امتیاز طرزی کو حاصل ہے انھوں نے سماجی، سیاسی، جاسوسی، تاریخی، نفسیاتی موضوعات پر ناول لکھے اور سائنس فکشن کے بنیاد گذار رہے۔

☆ طرزی نے اپنے تاریخی ناولوں کے وسیلے سے ہمیں اپنی تاریخ، تہذیب، تمدن اور معاشرے پر فخر کرنا سکھایا۔

☆ نوابین اودھ انسانیت نواز اور علم دوست کی حیثیت سے اپنی ایک الگ شناخت رکھتے تھے۔ ان کا ذوق تعمیر تو آثار کی شکل میں اب بھی نمایاں ہے۔ لکھنؤ کے تہذیبی مرقعے دستاویزی صورت میں گزشتہ لکھنؤ کا حصہ ہیں۔ اس کی بکھری ہوئی کہانیوں کو الگ الگ صورت میں اس طرح سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ افسانوی ادب کے ساتھ ساتھ ایک تہذیبی داستان کو بھی صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کی خان محبوب طرزی کی یہ کوشش بلاشبہ قابل تعریف ہے۔

☆ طرزی نے آزادی سے پہلے اور اس کے بعد دونوں زمانوں کو قریب سے دیکھا تھا اور تاریخ پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ تہذیبی و تمدنی سرگرمیوں کے وہ گواہ نہ سہی، نوابین اودھ کے آثار نے انہیں اس سے آگاہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ تاریخی ناول نگاری کے کوچے کی سیر محض یونہی نہیں کہی جا سکتی بلکہ وہ اس کے سرد و گرم چشیدہ تھے۔

☆ تاریخی، سائنسی اور تہذیبی و ثقافتی عناصر سے مزین ناولوں کے علاوہ طرزی نے جاسوسی ناول بھی لکھے۔ طرزی کے اہم جاسوسی ناولوں میں قربانی، سپیرا، حلقۂ نور اور پیغام اجل شامل ہیں۔ اردو میں جاسوسی ناولوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ طرزی چونکہ تاریخ، جراحت اور سیاست سے اچھی طرح واقف تھے اسی لئے جاسوسی اور مہم جوئی کے دوران وہ اپنی معلومات سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے تھے۔ اسی لئے قاری کی دلچسپی اور تجسس برقرار رہتا تھا۔

☆اسی سائنسی ناول میں جگہ جگہ خان محبوب طرزی نے نادیدہ طاقت یعنی خدا کے ہونے کا اعتراف سائنسدانوں کی زبان سے کرایا ہے اور ان میں سے بیشتر مقامات وہ ہیں جہاں وہ خود کو بے بس اور لاچار محسوس کرتے ہیں۔ زہرہ کا سفر سائنس کی ترقی کا کارنامہ ہوتے ہوئے بھی ایمان ویقین کی دنیا سے اپنا رشتہ استوار رکھتا ہے۔

مندرجہ بالا اقتباسات کے مطالعہ سے قاری کو اس بات کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہ ہوگا کہ یہ ''دیباچہ'' کتنا اہم ہے اور ڈاکٹر عمیر منظر کا یہ دیباچہ یقینا قابل مطالعہ ہے۔ پیش لفظ، دیباچہ اور اظہار تشکر کے بعد اصل کتاب کا باب اوّل آتا ہے۔ جس کا عنوان ہے ''احوال و کوائف'' اس باب میں کل ۲۵ رمضامین شامل ہیں۔ یہ تمام مضامین طرزی کی شخصیت اور سوانحی کوائف سے متعلق ہیں۔

دوسرے باب کا عنوان ہے ''طرزی کا فکشن'' اس باب میں کل ۱۱ رمضامین شامل ہیں۔ ان مضامین میں طرزی کی ناول نگاری کا احاطہ کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا دونوں باب میں شامل کل ۳۶ رمضامین جن قلمکاروں کے ہیں ان میں سے کچھ نام یہ ہیں۔ خان مسعود طرزی، خان رشید طرزی، سیّد احتشام حسین، حفیظ نعمانی، نورا لحسن ہاشمی، سلامت علی مہدی، مائل ملیح آبادی، نسیم انہونوی، فرقت کاکوروی، احمد جمال پاشا، شوکت تھانوی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، ضیاء عظیم آبادی، امین سلونوی، انور صابری، حکیم عبد القوی اور شارب ردولوی وغیرہ۔

تیسرے باب کا عنوان ہے ''ناولوں سے متعلق طرزی کی تحریریں'' اس باب میں وہ دس مضامین شامل ہیں جو خان محبوب طرزی نے اپنے ناولوں سے متعلق تعارفی تحریر یا پیش لفظ کے طور پر تحریر کئے تھے۔

چوتھے باب کا عنوان ہے ''طرزی کے ناولوں پر رائیں اور مقدمے'' اس باب میں کل ۵ رمضامین شامل ہیں۔ یہ وہ مضامین ہیں جو مختلف قلم کاروں نے طرزی کے ناولوں پر دیباچہ یا تعارف کے طور پر تحریر کئے تھے۔

پانچویں باب کا عنوان ہے ''خان محبوب طرزی کی تحقیقی تحریریں'' اس باب میں خان محبوب طرزی کے چار مضامین شامل ہیں۔

چھٹے باب کا عنوان ہے ''طرزی کا ناول و افسانہ'' اس باب میں طرزی کے ایک مشہور سائنسی ناول ''سفر زہرا کا'' اور ایک افسانہ ''زینب خطیبہ'' کو شامل کیا گیا ہے۔

ساتویں باب کا عنوان ہے ''طرزی کو کچھ دیگر تحریریں'' اس باب میں خان محبوب طرزی کی صحافتی تحریروں کے چھ نمونے شامل ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کتاب میں شامل مواد کو حاصل کرنے میں ڈاکٹر عمیر منظر نے کتنی محنت کی، کن کن مراحل سے گزرے۔ اس کا اندازہ عام آدمی یا قلم کار قطعی نہیں لگا سکتا۔ اس کا صحیح اندازہ تو وہی شخص لگا سکتا جس نے اس طرح کا کام انجام دیا ہو اور اسے ان مراحل سے گذرنے کا ذاتی علم ہو۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عمیر منظر نے اپنے مضمون اظہار تشکر میں کچھ روداد بیان کی ہے جن سے اندازہ لگتا ہے کہ ڈاکٹر عمیر منظر کو کن کن مراحل سے گذرنا پڑا۔ آخری مرحلے کا ذکر کرتے ہوئے وہ تحریر کرتے ہیں کہ ''طرزی سے متعلق گذشتہ ۴ برسوں کے درمیان جو مواد اکٹھا ہوا تھا ان کی جمع ترتیب اور کتابی صورت کا جب مرحلہ آیا تو بطور خاص پروفیسر عبدالرشید، پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر سراج اجملی نے رہنمائی کی اور انہیں کے مشوروں کی عملی صورت یہ کتاب ہے۔''

کیا مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں بھی ''خان محبوب طرزی: لکھنؤ کا ایک مقبول ناول نگار'' کو صرف ڈاکٹر عمیر منظر کی ترتیب ماننا درست ہوگا؟۔۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔۔۔۔قطعی نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔میں اس بات کو ماننے کو تیار نہیں ہوں ان حقائق کی روشنی میں بھی اپنے موقف پر قائم ہوں کہ یہ ڈاکٹر عمیر منظر کا ایک تحقیقی کام ہے۔ جسے انھوں نے صبر آزما منزلوں سے گذرتے ہوئے بڑی عرق ریزی کے ساتھ انجام دیا ہے۔

ڈاکٹر عمیر منظر کے حوصلے کی داد دیتے ہوئے مجھے اس بات کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں ہے کہ اپنی اس گرانقدر خدمت کی بدولت انھوں نے نہ صرف اپنے کو نثری ادبی تاریخ میں محفوظ کر لیا ہے بلکہ انھوں نے اپنے آپ کو معتبر تحقیقی حوالے کے طور پر بھی ثبت کر لیا ہے۔ آئندہ جب کبھی بھی خان محبوب طرزی کی ناول نگاری کا ذکر آئے گا تو ڈاکٹر عمیر منظر کا نام جلی حروف میں سامنے آئے گا۔

ڈاکٹر عمیر منظر کی کتاب ''خان محبوب طرزی: لکھنؤ کا ایک مقبول ناول نگار'' نئی نسل کے لئے ایک گرانقدر تحفہ ہے۔ اس کے ذریعہ نہ صرف خان محبوب طرزی کی حیات و جہات کا علم ہوگا بلکہ ان کی تحریریں اور مکمل ناول و افسانہ کو بھی پڑھنے کا موقع ملے گا۔

امید ہے کہ ڈاکٹر عمیر منظر کی یہ کتاب علمی اور ادبی حلقوں میں قبول عام کی سند حاصل کرے گی اور ان کی محنت شاقہ کا اجر دلانے میں کامیاب ہوگی۔

☆☆☆

سعد اللہ اسودؔ کی ''خاموش مسافت''

مسعود تنہاؔ
ایڈیٹر فکرِ نو، سرکلر روڈ، ساہی وال، ضلع سرگودھا 40210 (پاکستان) موبائل نمبر: 00923016546290

میاں محمد سعد اللہ اسودؔ کا میانہ ایک درویش منش، ادب دوست، ادب نواز اور انسانیت سے محبت اور رواداری کے قائل تھے، ساہیوال (سابقہ منٹگمری) میں ادبی تنظیموں کے سرپرست رہے کچھ عرصہ ایک ادبی جریدہ ''قندیلِ ادب'' بھی نکالا۔ واپڈا میں آفیسر بھی رہے۔ ادبی تقاریب، اپنے درِ دولت پر مشاعروں کے انعقاد کے سلسلہ میں دوستوں کو اکٹھا کرنا، ساہیوال کی کوئی بھی ادبی تقریب ایسی نہیں جس میں انہوں نے ادبی فروغ اور انسانیت کے فلاحی کاموں کیلئے ہر ممکن تعاون نہ کیا ہو۔ خدمتِ ادب سے انہیں دلی طور پر سکون ملتا ہے۔

میاں محمد سعد اللہ اسودؔ کا میانہ انسانیت کے رنج والم کو نہ صرف محسوس کرتے تھے بلکہ وہ ان کے جائز حقوق کیلئے اپنی آواز بھی بلند کرتے رہے۔ حساسیت اور دردمندی ان کی شخصیت کا خاص وصف تھی۔ وہ جاگیرادارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے سخت خلاف تھے جہاں متوسط طبقے کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں کو بے دریغ قتل کیا جاتا ہے اور ان زندگی کی تمام آسائشیں چھین لی جاتی ہیں وہ ان حالات میں تڑپ اٹھتے تھے۔ اور اپنے اشعار میں ان حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے نظر آتے۔ وہ بنیادی طور غزل کے شاعر تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ نظم کو بھی انہوں نے ذریعہ اظہار بنائے رکھا، وہ نظم میں بھی نہایت قرینے سے اپنی بات کہہ جاتے تھے۔ کسی بھی شاعر کے بارے میں یہ بجا طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ وہ روایت پسند نہیں، روایت اور جدت کا امتزاج اور نئی بات کہنے کا ہر شاعر کے ہاں اپنا الگ رنگ ڈھنگ اور اسلوب ہوتا ہے۔ وہ میرؔ، مجید امجد اور ناصر کاظمی سے متاثر تھے۔

ان کے شعری مجموعہ ''خاموش مسافت'' کے بیشتر اشعار میں وہ شعری تقاضوں اور ضابطوں کی پابندی کو رد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

''خاموش مسافت'' میاں محمد سعد اللہ اسودؔ کا میانہ کا تیسرا شعری مجموعہ ہے، اس سے قبل ان کی دو شعری کتب ''نقوشِ ہستی'' اور ''دِرادراک پہ دستک'' شائع ہو چکی تھیں۔ میاں محمد سعد اللہ اسودؔ کا میانہ، زندگی کے تمام پہلوؤں کا بڑی باریک بینی سے احاطہ کیا۔ وہ سادہ طبع، قناعت پسند اور خلوص وانکسار کے پیکر، ایک سچے اور کھرے انسان تھے۔ 5۔ جنوری 2012ء میں ان کی رفیقہ حیات دارِ فانی سے رخصت ہوئیں تو انہیں گہرے صدمہ سے دو چار ہونا پڑا تھا۔ انہوں نے اپنی اہلیہ مرحومہ کیلئے جو شاعری تخلیق کی، اس سے ان کی باطنی تکالیف اور رنج والم کا واضح احساس ملتا ہے۔ ''خاموش مسافت'' میں زیادہ تر غزلیہ شاعری ہے جبکہ چند قطعات اور مجید امجد پر نظم اور دیگر نظمیں بھی شامل ہیں۔

(۲۹) • ادبی نشیمن ـــ

گزشتہ چند برسوں سے وہ واپڈا ٹاؤن لاہور میں مقیم تھے۔ادبی محفلوں میں بہت کم جاتے تھے۔اس حوالے سے بھی وہ کہتے تھے کہ ان کا کوئی ایسا رفیق نہیں ہے جس کے ساتھ وہ تقریبات میں شریک ہوں۔ احساسِ تنہائی اور رفیقہ حیات کی جدائی کے غم نے ان کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے ۔ ابتدائیہ میں وہ لکھتے ہیں۔

''میری زوجہ محترمہ پیار کی دیوی، حسین دل کی مالک تھیں اور حسنِ اخلاق اور کردار میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔وہ بڑی خوش اخلاق، نیک سیرت، خداترس، انصاف پسند اور سخی دل عورت تھی۔ بندہ اپنی وفا شعار بیوی کو کیسے بھول سکتا ہے۔''

میاں محمد سعد اللہ اسودؔ کامیانہ نے اپنی رفیقہ حیات کے تمام اوصاف کو اپنی ذات میں جذب کر کے اپنی زندگی کا محور و مرکز بنا لیا ہے۔امید ہے یہ مجموعہ بھی ان کے قارئین پر گہرے اثرات مرتب کرے گا۔

ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

تمہارے پیار کی سوغات ہی تو زندگانی ہے
ہمیشہ کی طرح اب بھی وفا کرتی تو اچھا تھا
جدائی کا زہر کب تک ہمیں قسمت پلائے گی
خُدا سے پوچھ کر یہ بھی بتا دیتی تو اچھا تھا
مرا بھی حوصلہ دیکھو کہ جس بِن پل نہ کٹتا تھا
اُسے مَیں اپنے ہاتھوں سے ابھی دفنا کے آیا ہوں
تجھ سے تو کچھ رہی ہے ملاقات اس طرح
جیسے کوئی خیال سا آئے ہوا کے ساتھ

ان کے چند دوسرے عمدہ اشعار بھی دیکھیے:۔

اتنے دنوں قریب رہا ہے تو یوں نہ جا
اے بے شعور! ہم سے کوئی بات سیکھ لے
افسوس ہو سکے نہ ترے ہم خیال ہم
ویسے تو مدتوں کے ترے آس پاس تھے
برسے گا اب کہاں سے دُعاؤں کا سلسلہ
جب مامتا کا سایہ ہی سر پر نہیں رہا
کیوں یہ دستِ طلب دراز کیا؟
پوچھتی ہے مری انا مجھ سے
دو گھڑی انجمن آرائی ہے
پھر وہی گوشۂ تنہائی ہے
خوشبوئے زلفِ یار بھی آئے ہوا کے ساتھ
لیکن یہ آس کون لگائے ہوا کے ساتھ

سعد اللہ اسودؔ عارضۂ قلب میں مبتلا تھے اور ایک شام جب ان کے گھر ملنے کیلئے گیا تو معلوم ہوا کہ ایک ہفتہ پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ایسے درویش منش انسان دھرتی پر خال خال نظر آتے ہیں اور ان جیسے گمنام اور گنے چنے لوگ ہی اپنے اخلاص اور وضع داری سے دلوں میں گھر کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، اور لواحقین کو صبر کی دولت سے مالا فرمائے۔(آمین)

☆☆☆

غزل

مسعود تنہاؔ
00923016546290

تیرا اپنا ہوں دیکھ بھال مجھے
کھو نہ جاؤں کہیں سنبھال مجھے

مَیں ہوں سورج ترے زمانے کا
دوست! ممکن نہیں زوال مجھے

وہ ترے ساتھ اب نہیں ہوتے؟
لوگ کرنے لگے سوال مجھے

مَیں تو پہلے بھی ہوں مصیبت میں
اور مشکل میں تُو نہ ڈال مجھے

مَیں چلا تو گیا تھا دُور کہیں
پھر ترا آ گیا خیال مجھے

مار ڈالے گی ایک دن تنہاؔ
یہ تری شوخیٔ جمال مجھے

قطعہ

عوام الناس کی ہے جیب خالی
محافظ ہی لٹیرے بن گئے ہیں
ملے گا کس طرح انصاف ہم کو؟
مخالف جب وڈیرے بن گئے ہیں

☆☆☆

چودھری محمد علی ردولوی کے خطوط میں خطوطِ غالب کی جھلک

نادرہ پروین
ریسرچ اسکالر، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ موبائل: 6393219772

خطۂ اودھ کے اضلاع میں شامل ضلع بارہ بنکی کے قریب قصبہ رُدولی اپنی ایک تاریخی، سیاسی اور تہذیبی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سرزمین میں بڑے بڑے علماء، صوفی، شاعر اور ادیب پیدا ہوئے۔ ان ادیبوں میں ایک نام چودھری محمد علی ردولوی کا ہے۔ آپ ۱۸۹۲ء میں چودھری احسان رسول تعلقہ دار کے گھر میں پیدا ہوئے۔ جن کا شجرہ نسب حضرت ابوبکرؓ کی اولاد حضرت محمد بن ابوبکر سے جاملتا ہے۔

چودھری محمد علی ردولوی اردو ادب میں ایک مشہور افسانہ نگار، مزاح نگار، انشائیہ نگار، خاکہ نگار کے ساتھ ہی مکتوب نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ آپ نے ادبی سفر کا آغاز بیسویں صدی کے نصف آخر سے کیا۔ اتالیق بی بی، یادگار مولوی کرامت حسین، گناہ کا خوف، اصلاح کار، کشکول محمد علی شاہ فقیر، پردے کی بات، میرا مذہب، نقادی کے نقطے، گویا دبستان کھل گیا وغیرہ تصانیف تخلیق کر کے اردو ادب میں بیش بہا اضافے کیے۔

خطوط نگاری کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اردو ادب میں خطوط نویسی عربی و فارسی کی رہین منت ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو ادب میں بہت سے مکتوب نگار رجب علی بیگ سرور، سرسید احمد خاں، مولانا حالی، مولانا شبلی، محسن الملک، مولانا وابوالکلام آزاد، مولوی عبدالحق وغیرہ مکتوب نگار پیدا ہوئے۔ مگر جو اولیت و مرتبہ مرزا اسداللہ خاں غالب کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے مکتوب نگار کے حصے میں نہیں آئی۔ اگرچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ادبیت سے مملو بہت سے خطوط لکھے لیکن ان کا انداز غالب سے یکسر مختلف ہے۔ خطوط غالب کی عظمت کا اعتراف بیشتر ناقدین نے کیا ہے۔ خواجہ احمد فاروق صاحب یہاں تک کہہ گئے:

''خاکم بدہن اگر دیوان غالب نہ ہوتا اور صرف خطوط غالب ہوتے تو بھی غالب غالب ہی ہوتے۔''

فاروقی صاحب کا یہ قول غالب کے خطوط کی ادبی عظمت کا زبردست اعتراف ہے اور یہ اعتراف کچھ بے جا نہیں بلکہ صد فیصد درست ہے۔

خطوط غالب کی عظمت کئی امور پر مضمر ہے۔ ان کے خطوط کی سادگی، رعنائی، ظرافت، اپنائیت اور سب سے بڑھ کر ان کا انداز بیان ہے۔

ع- کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

غالب کا یہی انوکھا انداز بیان ان کے خطوط کی جان ہے۔ ورنہ دوسری باتیں آپ کو دیگر مکتوب نگار میں دیکھنے کو مل جائیں گی۔

غالب خط کیا لکھتے ہیں بس اپنے انداز بیان کا جادو قاری پر چلائے جاتے ہیں اور قاری ان خطوط کی مسحور کن کیفیت سے لطف اندوز ہوتا چلا جاتا ہے۔ چودھری صاحب خطوط نگاری کے میدان میں قدم رکھتے ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ غالب کا اسلوب غالب پر ختم نہیں ہوا بلکہ آگے چل کر چودھری محمد علی صاحب نے خطوط نگاری میں احیا کی طرف توجہ دی۔ چودھری صاحب کے مختصر تعارف میں ایک اقتباس رقم طراز ہیں:

''گویا دبستان کھل گیا چودھری محمد علی صاحب کے مکاتیب کا انتخاب ہے۔ اس کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کس طرح سے چودھری صاحب نے غالب کے

رنگ میں قلم ہاتھ میں لیا اور اپنے مکتوبات میں غالب کے جلوے بکھیرے ہیں۔''

غالب سے قبل مقفع و مسجع عبارت سے پُر ہوا کرتی تھی۔ لمبے لمبے القاب وآداب، مشکل زبان و بیان کی روش عام تھی۔ غالب نے ان روایتوں سے انحراف کرتے ہوئے مکالماتی اور عام بول چال کی زبان میں خطوط لکھے۔ اس جدت پسندی کے احساس سے غالب بخوبی واقف تھے۔ جس کا اظہار وہ اپنے خطوط میں ایک جگہ کرتے ہیں۔ مرزا حاتم علی مہر کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کی ہے جو مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔ ہذبان قلم سے باتیں کیا کرو ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔''

چودھری صاحب نے یہی مکالماتی انداز اختیار کیا۔ گویا دبستان کھل گیا میں شامل چند خطوط پیشِ خدمت ہیں جو بے تکلف اور عام بول چال کی زبان میں تحریر ہے۔ عتیق بیٹی کے نام ایک خط میں یوں لکھتے ہیں:

''عتیق یہ تو بتاؤ جب تمہارے میاں دفتر چلے جاتے ہیں تو کیوں کر وقت کاٹتی ہو؟ دو چار جاننے والیاں قریب میں ہیں یا بالکل تنہائی ہے۔''(ص:۲۶)

بیٹے نجے کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''بیٹا نجے! خدا تم کو خوش رکھے اور تمہارے نیک دلی، نیک نیتی اور نیک عملی کا اجر دے۔''(ص:۵۴)

چودھری صاحب کے ان خطوط کو پڑھ کر اور ساتھ ہی غالب کے خطوط کو سامنے رکھئے تو ان کے جملوں سے صاف طور پر پتا چلتا ہے کہ چودھری صاحب کے خطوط غالب کے خطوط کی خوبیوں کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ غالب کے خطوط کی طرح چودھری صاحب کے خطوط کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ جیسے مکتوب الیہ سامنے موجود ہے اور اس سے باتیں کر رہے ہیں۔

غالب نے اپنے خطوط میں طویل القاب وآداب کے بجائے مختصر القاب و آداب کا استعمال کیا۔ صرف مختصر ہی نہیں بلکہ مکتوب الیہ کی مناسبت سے چھوٹے بڑے کی حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے القاب کا استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر میاں جان، بھائی، برخوردار، جانِ غالب، راحتِ جاں، پیر و مرشد، بندہ پرور، قبلہ و کعبہ وغیرہ القاب سے پکارتے ہیں۔ یہی خوبی چودھری صاحب کے خطوط میں جا بجا دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہما بیگم کے لیے میری جاں، ہما پیاری، پیاری ہما جیسے القاب سے پکارتے ہیں۔ چھبن کو پیاری چھبن، عتیق کو پیاری عتیق، عابد میاں کو لختِ جگرم، عزیز صاحب کو یار عزیز اور ڈپٹی وغیرہ القابات استعمال کرتے ہیں۔ القابات وخطابات کا یہ انداز بالکل غالب کا سا ہے۔ ان کے بعض خطوط میں مائی ڈیئر جیسا لقب بھی ملتا ہے۔ شاید ہی غالب کے خطوط میں یہ القاب استعمال ہوا ہو۔ اسے چودھری صاحب کا اجتہاد کہا جا سکتا ہے۔

غالب کی طرح چودھری صاحب بھی غیر ضروری تمہید سے پرہیز کرتے ہیں ۔ وہ مکتوب الیہ کو پکارتے ہیں تمہید باندھے بغیر مطلب کی بات شروع کر دیتے ہیں۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

لاڈلی بیٹی ہما بیگم کے نام ایک خط یوں شروع ہوتا ہے:

''ہمار بیگم! سنو آج میں بہت پریشان رہا اور پریشان ہوں۔''(ص:۷۰)

نیاز فتح پوری کے نام خط میں نیاز فتح پوری سے مخاطب ہوتے ہوئے اصل مدعا پر آتے ہیں، لکھتے ہیں:

''کرم فرمایہ۔ اس طرف لکھنؤ پہنچنے کی امید تو کم ہے۔''

مرزا محمد وصی کے نام ایک خط کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

''عزیزی وصی میاں۔ دعا! آپ جس وقت چاہے تشریف لائیے، ہم لوگوں کو دلی خوشی ہوگی۔''(ص:۱۱۳)

ان خطوط سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ چودھری صاحب بھی غیر ضروری تمہید نہیں باندھتے اور یہ انداز بھی چودھری صاحب نے شعوری یا غیر شعوری طور پر غالب سے لیا ہے۔

غالب کی طرح چودھری صاحب بھی اپنے خطوط میں صنائع بدائع، مشکل الفاظ اور طویل جملوں کے استعمال سے مکتوب الیہ کو بور نہیں کرتے بلکہ ان کی جگہ سادہ و آسان الفاظ اور جملوں کا استعمال کر کے مکتوب الیہ کو لطف فراہم کرتے ہیں۔

مرزا وصی ایڈوکیٹ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''صفیہ بیگم سلمہا اور بچوں کو دیہات کو سیر کرواتے۔ اپنے ہاتھ سے مٹر کی پھلیاں توڑی جاتیں، بوٹ توڑے جاتے۔ اس خالی فصل میں سب کھیت خالی پڑے ہیں۔ آم کا آرا تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔'' (گویا دبستان کھل گیا (ادبی

خطوط)، چودھری محمد علی ردولوی، ص: ۱۱۳)

چنانچہ ان کے خطوط اول تا آخر سادگی، بے تکلفی، بے لوثی اور خلوص ومحبت کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔ اپنے ایک دوست کو انتہائی سادگی کے ساتھ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''معلوم نہیں کب سے ملاقات نہیں ہوئی۔ نہ معلوم کیوں۔ مگر آپ کے دیکھنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ مواقع اتنے کم رہ گئے ہیں اور میرا سن اتنا زیادہ ہوگیا ہے کہ اگر دید کی صورت نہ بندھے اور میرا رخصت سفر بندھ جائے تو تعجب نہیں۔'' (ص:۵۹)

اس اقتباس میں تصنع اور تکلف چھو کر بھی نہیں گئی۔ سیدھے سادھے انداز میں اپنی بات کہتے ہیں۔

حالی نے غالب کو حیوانِ ظریف کہا تھا، کیوں کہا اس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ غالب کی یہی شوخی وظرافت ان کے خطوط میں بھی رنگ بھرتی دکھائی دیتی ہے۔ یہی خوبی چودھری صاحب کے خطوط میں رنگ بھرتی ہے۔ بہرکیف ان کے خطوط میں بھی شوخی وظرافت کے پہلو نمایاں ہیں۔ ہاشمی صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اس نے کہا وہ لڑکا تمہارا تھا ہی نہیں۔ اگر تمہارا ہوتا تو تمہارے پاس رہتا نا، وہ جس کا تھا اس نے لیا؟ کیوں رنج کرتے ہو؟'' (ص:۱۱۸)

اس اقتباس کو پڑھ کر کوئی بھی صاحب مذاق زیرلب مسکرائے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ اس طرح کے اقتباسات سے خطوط غالب کے ظریفانہ اقتباسات کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

چودھری صاحب کے خطوط میں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ سیاسی، سماجی، معاشرتی بدحالی، مذہبی، نجی زندگی کے تمام پہلو وغیرہ موضوع پر قلم بند کیے ہیں۔ ساتھ ہی مطلب کی وضاحت کے لیے مناسب طور پر تشبیہات واستعارات، کنایے اور مناسب محاوروں کا بھی برجستہ استعمال کرتے ہیں۔ جو ان کے خطوط میں حسن پیدا کرتی ہے۔

ایک خط چودھری محمد علی صلاح الدین صاحب کے نام لکھتے ہیں:

''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' امید ہے کہ ڈھائی برس کے بعد پریس سے آجائے۔ جیسے ہی آگئی حاضر کردوں گا مگر صلاح الدین صاحب! چھاپنے والے نے کیا ظلم کیا ہے۔ چھپائی ایسی ہے جیسے یتیم بچے کا منہ ہوتا ہے۔ غلطیاں ایسی ہیں کہ جیسے برے گھر کی لونڈی ہوتی ہے۔ کتاب مسخ ہوکر رہ گئی ہے اور ہم ہیں کہ بس بے اختیار دم بخود بیٹھے ہیں۔'' (گویا دبستان کھل گیا (ادبی خطوط)، چودھری محمد علی ردولوی، اردو اکیڈمی، سندھ کراچی، ص:۹۹)

اس خط میں معاشرتی پہلو اور نفسیاتی پہلو ہے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے برجستہ تشبیہات کا استعمال کرتے ہیں۔

دوسرا خط زمینداری کے جانے سے تعلق سے مرزا محمد وصی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''زمینداری جانے کی وجہ سے نہال اقبال میں دیمک ضرور لگ چکی ہے اور کھڑی کھڑی ترقی کرتی جاتی ہے۔'' (ص:۱۲)

اس اقتباس میں شان وشوکت کے زوال کو دیمک لگ جانے سے تعبیر کیا ہے۔

ان خوبیوں کے علاوہ ان کے خطوط میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ موقع کی مناسبت سے اشعار نقل کیے ہیں۔ ہما بیگم کے نام ایک خط میں اپنے بیٹے سلمان کو خط نہ آنے کی شکایت کرتے ہوئے یہ شعر رقم کرتے ہیں:

رہ گئی بات کٹ گئی شب ہجر
تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

بیٹی عتیق کے نام خط میں غالب کا یہ شعر نقل کرتے ہیں:

چاک مت کر حبیب بے ایام گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

چنانچہ اشعار کے برمحل استعمال میں بھی چودھری صاحب نے خطوط غالب کی تقلید کی ہے۔

اس پوری تفصیل سے یہ واضح ہے کہ چودھری صاحب کی خطوط نگاری میں شعوری یا غیر شعوری طور پر خطوط غالب کی تقلید کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور کافی حد تک خطوط غالب کی جھلکیاں دکھانے میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ صلاح الدین احمد لکھتے ہیں:

''جن صاحبوں نے مکاتیب غالب کے بعد خطوط کے ان متعدد مجموعوں کا مطالعہ کیا ہے جو وقتاً فوقتاً گذشتہ پون صدی میں ہمارے سامنے آئے ہیں، وہ مجموعہ زیر نظر کو دیکھنے کے بعد غالباً میرے اس خیال کی تائید فرمائیں گے کہ جن خوبیوں اور خصوصیات سے غالب کے خطوط کو دوام بخشا وہ ایک لباس تازہ میں اس مجموعہ کی زیب وزینت ہیں۔ وہی سلاست، وہی بے تکلفی، وہی شگفتگی اور سب سے بڑھ کر وہی احساس یگانگت اور وہی کیف مخاطب جو اردوے معلی اور عود ہندی کے مکاتیب میں پایا جاتا ہے۔ ایک بڑی حد تک ان خطوط میں بھی اپنی پوری رعنائی سے جلوہ افروزا ہے۔'' (ص:۱۱)

☆☆☆

منشا یاد کی افسانہ نگاری

(شب خون کے حوالے سے)

عافیہ حمید

ریسرچ اسکالر، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ Mob.: 7897811988

ماہنامہ شب خون، شمس الرحمن فاروقی (2020-1935) نے 1966 میں شہر الہ آباد سے جاری کیا تھا۔ یہ وہ رسالہ تھا جو ادبی معیار جانچنے کا معیار ثابت ہوا۔ شب خون فاروقی صاحب کے مزاج کے عین موافق تھا۔ اس رسالے میں صرف ان ہی لوگوں کی تحریریں شائع ہوتیں جو واقعی فنکار ہوتے۔ کسی بھی قسم کی رشتہ داری کے بجائے یہاں حقیقی صلاحیت کو فوقیت دی جاتی۔

شب خون میں شائع ہونا گویا حقیقی فنکار ہونے کی شہادت تھی اور یہ شہادت آج بھی مسلم سمجھی جاتی ہے۔ آج بھی اگر کسی کے سامنے آپ ذکر کریں کہ فلاں صاحب شب خون میں شائع ہوتے رہے ہیں تو لوگ بلاتردد اس کی ادبی ہنرمندی کا اعتراف کر لیتے ہیں۔

یوں تو شب خون میں نظم ونثر، تبصرے، ترجمے سبھی کچھ شائع ہوتے رہے ہیں۔ مگر آج میں شب خون میں شائع منشا یاد کے افسانوں پر بات کروں گی۔ لاہور (موجودہ پنجاب) میں یکم شوال بروز عید ۵ ستمبر ۱۹۳۵ کو منشا یاد نے آنکھیں کھولیں اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ نازک پودا ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر گیا۔ منشا یاد کی علمی چاہ اتنی تھی کہ تعلیم کے لیے روزانہ تقریباً بیس میل کا سفر طے کرتے تھے۔ منشا یاد کو "یاد بھٹی" (قلمی نام) بننے میں سب سے اہم کردار ان کی ماں کا تھا جن کی خواہش تھی کہ ان کا بچہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ منشا یاد کے اندر قصے کہانیوں کا شوق ماں کی وجہ سے پیدا ہوا۔ آپ ہائی اسکول سے ہی لکھنے لگے۔ پھر باقاعدہ طور پر لاہور سے نکلنے والے رسالے ''ہدایت'' میں ان کی چند کہانیاں اور نظمیں شائع ہوئیں اور پھر یہ قلم چل پڑا۔ اس طرح سے ادبی دنیا کا سورج پوری آب وتاب کے ساتھ نمودار ہوا۔

منشا یاد کی آنکھیں گویا کیمرے کی مانند اپنے اردگرد کے تمام مناظر کو قلم کے سہارے صفحہ قرطاس پر قید کرنے کو بے تاب رہتی تھیں۔ پے در پے آپ کے افسانوی مجموعوں نے ادبی دنیا میں دھوم مچا دیا تھا۔ آپ کے جن افسانوں نے شہرت کی منزلت پائی ان میں بطور خاص چند کے نام یوں ہیں:

کھلی آنکھیں، بند مٹھی میں جگنو، دل کا بوجھ، شب چراغ، تماشا، دنیا کا آخری بھوکا آدمی، ماں جی، پے اینگ گیسٹ، مائی فٹ، آگے خاموشی ہے، وغیرہ۔ منشا یاد کے افسانوں کی انفرادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے تین افسانے "ماں جی"، "چاہ در چاہ"، "بیتال کتھا"، شب خون کے انتخاب کی زینت بنے۔

"ماں جی" ایک جذباتی افسانہ ہے۔ فلش بیک کی تکنیک اس افسانے میں بار بار سامنے آتی ہے۔ اس افسانے میں رشتوں کی آپسی محبت و ہمدردی کے خوبصورت سنگم کا احساس ہوتا ہے۔ خوبصورت منظر نگاری افسانے کی سب سے بڑی خوبی کے طور پر نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منشایاد کے افسانے اپنے وقت اور حالات کی منہ بولتی تصویر سی لگتی ہے۔ افسانے میں ماں کی محبت کا سب سے حسین منظر اس وقت نظر آتا ہے جب ماں بچے سے ملنے بیس میل کا سفر پیدل طے کر کے پہنچتی ہے اور بیٹے کے پیروں میں پھٹے جوتے دیکھ کر آنسوؤں سے رو پڑتی ہے:

''تمہارے جوتے کہاں ہیں؟''

میں چپ رہا تو انہوں نے پھر پوچھا۔ میں پھر بھی خاموش رہا تو وہ رونے لگیں۔

تم اساڑھ کی اس گرمی میں پتھریلے راستوں پر ننگے پاؤں چل کر اسکول آتے جاتے ہو؟

وہ اتنا روئیں کہ اگر میں خالی گلاس ان کے سامنے رکھ دیتا تو وہ ان کے آنسوؤں سے بھر جاتا۔ لیکن اچانک ایک خوشگوار خیال سے ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ بولیں۔ آج مجھے یقین ہو گیا میرا خواب ضرور پورا ہو گا تم پہلی آزمائش میں پورا اترے ہو۔''

اس افسانے میں ایک عورت کے مختلف کردار نظر آتے ہیں۔ کبھی مشفق ماں کی صورت میں، کبھی ہمدرد بہن کی صورت میں اپنے بھائی کو خط لکھتے ہوئے اس کی آواز بھرا جاتی ہے اور خط ادھورا چھوڑ دیتی ہے۔ آخر میں یہی عورت سسرالی رشتوں میں صبر و شکر کی تصویر بن کر ابھرتی ہے۔ اس افسانے کی تخلیق کے ذریعہ منشایاد نے عورت کے تمام تر روپ سے انصاف کیا ہے اور سماج کے سامنے ایک باوفا عورت کا تصور پیش کیا ہے۔

شب خون کے حوالے سے منشایاد کا دوسرا اہم افسانہ ''چاہ در چاہ'' ہے۔ منشایاد نے اس افسانے میں چاہ یعنی کنواں کو ایک استعارے کے طور پر پیش کیا ہے۔ چاہ در چاہ۔ شاید اس چاہ کا اشارہ چاہ یوسف کی طرف ہے۔ افسانے پر غور و فکر کے بعد جو بات ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ منشایاد صنف نازک کے استحصال پر ماتم کناں ہیں۔ کیونکہ اس افسانے میں دکھایا گیا ہے کہ مرکزی کردار ''جمیلہ'' بار بار دھوکے کا شکار ہوتی ہے۔ جمیلہ اس افسانے کی ہیروئن ہے جسے ایک بولڈ اور شوخ لڑکی کے طور پر میں دکھایا گیا ہے۔ آخر میں وہ اپنے ہی سماج کے ذریعے بری طرح استحصال کا شکار ہوتی ہے اور پھر پے در پے دھوکے کے بعد وہ اندر سے بالکل مر جاتی ہے۔

منشایاد کے افسانے پنجاب کے ماحول و معاشرے کی سچی تصویر بیان کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں مقامی زبان کے بہت سے محاورے اور الفاظ نظر آتے ہیں۔ منشایاد کے افسانوں کی ایک بڑی خاصیت یہ ہے کہ ان کے افسانے آغاز میں کچھ الجھے ہوئے سے لگتے ہیں۔ جس سے عام ذہن کا قاری اُکتا کر افسانے سے نگاہیں پھیر لیتا ہے لیکن اگر وہ کچھ صبر کا مظاہرہ کرے اور افسانے کے ربط سے اختتام تک کا سفر طے کر لے تو وہ ایک دلچسپ افسانے سے لطف اندوز ضرور ہو گا۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ منشایاد کے افسانوں میں کہانی ایک دم سے کھل کر سامنے نہیں آتی۔ بلکہ اب سے اہم اور اصل بات ایک راز کی طرح افسانے کے آخر میں سامنے آتی ہے۔ منشایاد کے افسانوں کی ایک اور خاصیت جو متاثر کرنے والی ہے، وہ یہ کہ ان کا افسانہ اختتام تک پہنچتے پہنچتے قاری کے ذہن میں سوچنے کے لیے ایک نیا افسانہ اور ایک نئی کہانی دے جاتا ہے۔

منشایاد کا تیسرا اہم ترین افسانہ جو شب خون کے انتخاب میں شائع ہوا، وہ ہے ''بیتال کتھا''۔ بیتال کتھا ایک مکمل نفسیاتی افسانہ ہے۔ بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ یہ افسانہ بھی استعارے کے پردے میں آگے بڑھتا ہے۔ ایک کتیا اور اس کے بچے کو علامت کے طور پر لے کر تمام افسانے کا تانا بانا بُنا گیا ہے۔ جس سے غیر محسوس طریقے سے افسانہ انسانی سماج پر کاری ضرب لگاتا ہوا نظر آتا ہے۔ افسانے میں منشایاد نے یہ دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ بسا اوقات صلہ رحمی کے معاملے میں

جانور انسان سے کہیں زیادہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ ایک اقتباس سے یہ پیغام مزید واضح ہوکر سامنے آئے گا:

''ایک دن کا ذکر ہے حسو گھر سے کچھ فاصلے پر کولہو پر تھا اور اسے سخت بھوک لگی تھی۔ جب ڈری سہمی تیلن کھانا لے کے آئی عین اس وقت وہ کالی کتیا جو ہر روز اپنے پلے کے ساتھ کھانے کے وقت وہاں آجاتی تھی دروازے میں آکر اکڑوں بیٹھ گئی اور انتظار کرنے لگی کہ کب حسو کھانا کھائے اور کوئی ہڈی یا لقمہ اس کی طرف پھینکے۔ اس دوران میں اس کا پلا کھانے کی خوشبو سونگھتا کھانے تک پہنچ گیا۔ اور کندوری میں منھ ڈال کر روٹی کھینچ کر مزے سے کھانے لگا۔ حسو کی نظر پڑی تو اس نے ہاتھ بڑھا کر پلے کو گردن سے پکڑا اور چلتے کولہو میں پھینک کر پیل دیا۔ کتیا اس منظر کی تاب نہ لاسکی اور وہاں سے ہٹ گئی۔

اس روز کتیا روہاں سے ہٹ گئی۔ مگر جب حسو کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو وہ اکثر اس کے گھر کے گرد منڈلانے لگی۔ اور تاک میں رہتی کہ کب موقع ملے اور وہ اس کے بیٹے کو چبا کر اس سے انتقام لے۔

ایک دن کا ذکر ہے تیلی تیل بیچنے کہیں گیا ہوا تھا۔ تیلن گھر میں گوبر کا لیپ کر رہی تھی۔ اور بچہ پالنے میں لیٹا رو رہا تھا کہ کتیا کا وہاں سے گذر ہوا۔ وہ موقع پا کر دبے پاؤں اندر آئی اور بچے کو منھ میں اٹھا کر باہر لے گئی۔ پھر وہ ایک ویران گوشے میں پہنچی اور چاہا کہ اسے چبا جائے کہ بچہ قلقاری مار کر ہنس پڑا۔ کتیا نے اسے پہچان لیا۔ وہ حسو تیلی کا لڑکا مگر اندر سے اس کا پلا تھا۔ پھر وہ بڑا ہو گیا۔ مگر وہ اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے حسو کے گھر کے چکر لگاتی رہتی۔''

بلاشبہ یہ ایک طنزیہ افسانہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود افسانہ انسانی نفسیات کی تمام پرتیں کھولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ افسانے میں انسان اور جانور کے درمیان تفریق کی ۷ روجہیں بھی بتائی گئی ہیں۔ ان وجوہات کو سامنے رکھ کر پڑھ کر اگر کوئی انسان اپنا احتساب کرے تو وہ با آسانی اپنے نفس کا تزکیہ کرسکتا ہے۔ اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ افسانہ سیدھا انسانی سماج پر نشان زدگی کا کام کر رہا ہے اور انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کہیں ہم میں بھی وہ سات وجوہات میں سے کوئی ایک وجہ موجود تو نہیں۔ جن کا ذکر افسانے کی ہیروئن اپنے بیٹے سے کرتی ہے۔ جیسے حسو تیلی کا بیٹا اس لیے بہت ہی کم ظرف، بدمزاج اور ٹیڑھا آدمی ہوگا۔ دوسری نشانی یہ کہ غیروں کا وفادار ہوگا مگر اپنوں کا بیری ہوگا۔ تیسرے یہ کہ حرص وہوس کا پجاری ہوگا۔ اس کا پیٹ اور نیت کبھی نہیں بھرتے ہوں گے۔ کھانے اور خطرے کی بو دور سے سونگھ لیتا ہوگا۔ چوتھے یہ کہ اپنی برائیوں پر اتراتا ہوگا۔ پانچویں یہ کہ شریف اور نہتے آدمیوں پر بلاوجہ غراتا ہوگا۔ مگر جہاں کہیں سے ڈر یا فائدے کی توقع ہوگی وہاں مثل اپنی اصل کے پاؤں چاٹتا اور دم ہلاتا ہوگا۔ چھٹی یہ کہ اپنے ساتھیوں، دوستوں اور ان لوگوں کو موقع ملتے ہی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا جنہوں نے اس سے کبھی کوئی نیکی کی ہوگی یا جو اس سے رتبے میں آگے ہوں گے۔ اور ساتویں نشانی اس کی یہ ہے کہ اس کی وفاداری مشروط اور مشکوک ہوگی۔ کیونکہ کتے کی وفاداری دراصل ایک کھوکھلی خوشامد ہوتی ہے۔ جو اسے راتب ڈالتا ہے، اسی کے سامنے دم ہلاتا ہے۔ دوسرے کو کاٹنے کو دوڑتا ہے۔

منشایاد کے افسانے زمین سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا قلم انتہائی زرخیز، مطالعہ وسیع، نظر بلند اور مشاہدہ عمیق تھا۔ طبیعت میں نہایت ہی گہرائی و گیرائی تھی اور آپ کے افسانے حقیقی کردار تراشتے نظر آتے ہیں جو مدتوں ذہنوں میں محفوظ رہتے ہیں۔ ان کے افسانے بلاشبہ جذبات واحساسات کے حسین سنگم ہیں۔ آپ کے افسانوں کا تاثر اتنا زیادہ تھا کہ لاہور کی سرزمین سے ہندوستان تک اس کی آواز سنائی دیتی تھی۔ آج ہندو پاک دونوں ہی ملک میں ایک معتبر افسانہ نگار کے طور پر گردانے جاتے ہیں۔

☆☆☆

دبستانِ سیمابؔ کا ایک انقلابی شاعر: الطافؔ مشہدی

محمد صالح انصاری

ریسرچ اسکالر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

نام سید الطاف حسین اور تخلص الطافؔ، جو قلمی نام الطافؔ مشہدی سے معروف ہوئے۔ والد کا نام سید علی حسین شاہ تھا۔ الطاف کے آبا و اجداد کا تعلق خاندانِ سادات کے ایک ایسے طبقے سے ہے جو کسی زمانے میں مشہد سے نقلِ مکانی کر کے ہندوستان آیا اور افرادِ خاندان مشہدی کہلائے گئے۔ اسی مناسبت سے آپ الطافؔ مشہدی کہلائے۔ الطافؔ کی ولادت ۱۰ر فروری ۱۹۱۴ء کو آلومہار مشرقی سرگودھا پنجاب (مغربی پاکستان) کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوئی۔ ڈھائی سال کی چھوٹی سی عمر میں ہی شفقتِ پدری سے محروم ہوئے۔ والدہ کے زیر سایہ ابتدائی تعلیم کا اغاز لالیاں ضلع جھنگ اور جامکی ضلع سیالکوٹ سے کیا۔ دس سال کی عمر میں پرائمری تک کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مڈل میں داخلہ لیا جہاں انھیں ایک مشہور عالم سید حسین شاہ سے مسلسل دو سال تک مستفید ہونے کا موقع ملا۔ اسی اثنا وہ ادب کی جانب مائل ہوئے اور مطالعہ میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ ادبی زندگی کے آغاز کے تعلق سے، اپنی ابتدائی زندگی کے انہی ایام کا ایک واقع بیان کرتے ہوئے الطافؔ مشہدی فرماتے ہیں:

> ''ابھی میں چھٹی جماعت میں زیر تعلیم تھا کہ ماں اپنی چھوٹی بہن سے ملنے جلال پور شریف ضلع جہلم گئیں۔ واپسی پر ماموں نے بتایا کہ عرس میں لاہور سے ایک شاعر آیا ہوا تھا جو دربار شریف کے سامنے رات کے وقت اپنا پر جوش کلام ''شاہنامہ اسلام'' ترنم سے پڑھتا تھا اور لوگ جھومنے لگتے تھے اور بعض پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ بڑا تاثر تھا اُس شاعر کی زبان اور کلام میں۔ نام اُس شاعر کا شاید حفیظؔ جالندھری تھا۔ مجھے پہلے ہی سے کتب و رسائل کے مطالعہ کا چسکا پڑ چکا تھا۔ ماں کی زبان سے ایک شاعر کی تعریف سن کر تہیہ کر لیا کہ شاعر بنوں گا اور اندر کی آواز کو حقیقت میں تبدیل کر کے رہوں گا۔'' [۱]

یہی وجہ تھی کی الطاف مشہدی نے کم عمری سے ہی شاعری کا آغاز کر دیا تھا۔ ابتدا میں وہ علامہ محوی صدیقی لکھنوی اور دوسرے اساتذہ کو اپنا کلام دکھاتے رہے، اس کے بعد علامہ سیمابؔ کی شہرت کو دیکھتے ہوئے مستقل طور پر اُن کے دامنِ فیض سے وابستہ ہو گئے۔ الطافؔ مشہدی کا پہلا مجموعہ کلام ۱۹۳۹ء میں ''تصویر احساس'' کے نام سے شائع ہوا۔ پھر دو سال کی قلیل مدت میں ''پریت کے گیت'' کے نام سے ۱۹۴۱ء میں دوسرا مجموعہ کلام بھی منظرِ عام پر آیا۔ اِس کے بعد ''الطافؔ کے گیت'' اشاعت ۱۹۴۴ء، ''ڈگر'' باراوّل ۱۹۴۶ء، ''داغ بیل'' اشاعت اول ۱۹۵۰ء، ''الطافؔ کے نغمے'' لاہور راوی پبلشرز ۱۹۴۶ء، ''لذتِ رنگ و بو'' اور ''شاخِ گل'' وغیرہ کل آٹھ شعری مجموعے یکِ بعد دیگرے شائع ہوئے۔

(۳۷) • ادبی نشیمن ـــ

الطاف مشہدی کا نام ادبی دنیا میں نہ صرف ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوا، بلکہ ایک بہترین فکشن نگار اور معروف صحافی کے طور پر بھی لیا جاتا ہے۔ زمینداری اور صحافت دونوں ہی اُن کا ذریعۂ معاش تھا۔ الطاف صاحب ادب برائے زندگی کے قائل تھے اور اسی نظریے کے تحت انھوں نے شاعری کی اور فکشن بھی تحریر کیے۔ چوں کہ وہ ترقی پسند ادیبوں کی ادبی سرگرمیوں سے بے حد متاثر تھے۔ ان کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ ترقی پسند ادیبوں کی کہانیوں کا ایک ایسا مجموعہ پیش کریں جو درحقیقت ادب برائے زندگی کا آئینہ دار ہو۔ اپنی اسی خواہش کی تکمیل کے تحت انھوں نے ۱۹۴۰ء میں ''تازیانے'' کے نام سے ترقی پسند مصنفین کی پندرہ کہانیوں کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ اس کے بعد خود ان کے ڈراموں کا مجموعہ ''ریحانہ'' اور ''چاند بی بی'' منظرِ عام پر آیا۔ صحافت کے طور پر بھی ان کا رتبہ بہت بلند رہا ہے۔ سرگودھا سے ایک پندرہ روزہ رسالہ ''خلوص'' اور ایک ماہنامہ ''ہم لوگ'' انہی کی ادارت میں نکلتا تھا۔

الطاف مشہدی کی شاعری میں اختر شیرانی کی رومانوی شاعری کا پرتو نظر آتا ہے۔ اُن کی رومانی شاعری ان کے انجانے شوق کے اظہار کا ذریعہ تھی۔ مگر زندگی کے حوادث اور مشکل تجربات و مشاہدات نے اُن کے نظریہ حیات میں تبدیلی پیدا کر دی۔ انھوں نے رومان کے راستے حقیقت نگاری کی جانب قدم رکھا اور اپنی انقلابی نظموں اور گیتوں کے سہارے ایک مدت تک نوجوانوں کے دلوں پر راج کیا۔ الطاف کے انہی شاعرانہ جذبات سے متاثر ہو کر شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی رقمطراز ہیں:

> ''اقبال کے بعد زمانے نے ایک اور کروٹ بدلی اور شعرا کے نوجوان طبقہ میں جوش اور الطاف جیسے فیض شناس شاعر پیدا ہوئے۔'' ۲؎

اسی طرح علامہ نیاز فتح پوری جن کی تنقیدی تحریریں عام طور پر تنقیص معلوم ہوتی ہیں، انھوں نے الطاف کی شاعری کے تعلق سے اپنی ناقدانہ رائے دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''الطاف کا نام عرصہ سے ہمارے کانوں میں گونج رہا ہے اُن کی شاعری ہم کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے اور ایک نئے نظام کا پتہ دیتی ہے۔'' ۳؎

جب اردو شاعری نے اپنا روخ بدلا اور نئی انقلابی شاعری کا دور دورہ ہوا تو ایسے ماحول میں اُس عہد کے چند تعلیم یافتہ شعرا جن میں فیض، مجاز، علی سردار جعفری، سلام مچھلی شہری، مخدوم محی الدین، احسان دانش، ساغر نظامی، روش صدیقی اور جاں نثار اختر وغیرہ کے ناموں کی صف میں الطاف مشہدی کا نام بھی شامل ہے۔ الطاف مشہدی انقلابی شاعری کے ذریعہ اپنے ہم عصر شعرا کے طرز پر ملک و قوم کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھونے انقلابی اور خوشگوار نغموں سے عوام کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ اُن کی نظموں اور گیتوں نے نوجوانوں کے دلوں میں نئے نئے ولولے پیدا کیے۔ اس طرح وہ ایک نوجوان انقلابی شاعر کے طور پر ابھرے اور اپنی فنکارانہ صلاحیت کے سبب عوام میں مقبول ہوئے۔ ایک زمانے میں الطاف کی شہرت و مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ کسی مشاعرے میں اُن کی شرکت ہی محفلِ مشاعرہ کے کامیابی کی ضمانت ہوا کرتی تھی۔ مشاعروں کے تحت اُن کی شہرت کا زمانہ لگ بھگ دو دسک تک جاری رہا، اس عہد میں 'شاعر انقلاب' کی حیثیت سے جیسی شہرت و مقبولیت جوش ملیح آبادی کو حاصل تھی ٹھیک ویسے ہی عوام کی جانب سے الطاف کو بھی 'شاعر شباب' اور 'شاعرِ انقلاب' کے خطابات سے نوازا گیا۔ اس قول کی صداقت محترم جمیل یوسف صاحب کی اُس آپ بیتی سے ہوتی ہے جو ماہنامہ ''الحمرا'' میں قسط وار شائع ہوئی تھیں:

> ''ایک زمانہ تھا کہ سرگودھا کے شاعر سید الطاف مشہدی کی شہرت کا ڈنکا پورے برصغیر کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں بج رہا تھا۔ کوئی مشاعرہ ان کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جس طرح جوش کو شاعر انقلاب اور اختر شیرانی کو شاعر رومان کہا جاتا تھا اسی طرح الطاف مشہدی کے ساتھ شاعر شباب کا خطاب سج گیا تھا۔ الطاف مشہدی کی شہرت و مقبولیت کا یہ زمانہ ۱۹۴۵ء سے شروع ہو کر لگ بھگ ۱۹۶۵ء اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔'' ۴؎

الطاف مشہدی کو محفل مشاعرہ سے اس قدر قلبی لگاؤ تھا کہ مشاعرہ کا نام سن کر ان کے دل میں جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ یہی

وجہ تھی کہ وہ اپنی زندگی کی آخری خواہش کے طور پر محفلِ مشاعرہ سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔ مگر مے نوشی کی لت نے اُن کی صحت کو ایسے تباہ کیا کہ انھیں گھر سے نکلنے اور شعرا سے ملاقات تک کی بھی اجازت نہیں تھی۔ وہ صرف بادہ نوش ہی نہیں بلکہ بسیار نوش تھے۔ یہاں تک کہ سرگودھا میں شراب کی دکان کا ٹھیکہ بھی انہی کے پاس تھا۔ جمیل یوسف کے بیان کے مطابق الطافؔ صاحب جب بیحد بیمار ہوئے تو ان کی آخری خواہش کی تکمیل کے طور پر اُن کے گھر کے باہر کھلے صحن میں آخری بار محفل مشاعرہ کی بساط سجائی گئی۔ مگر اس وقت الطافؔ مشہدی کی صحت اس قابل نہیں تھی کہ وہ گھر سے باہر نکلتے اور مشاعرے میں شرکت کرتے۔ مگر چوں کہ مشاعرہ خاص کر انہی کے لیے کرایا جا رہا تھا، اِس لیے وہ اپنی چارپائی پر لیٹے ہی لیٹے گھر کے دریچے سے مشاعرے کا نظارہ کرتے رہے۔

الطافؔ مشہدی ایک دردمند انسان تھے، ان کے دل میں کسانوں، مزدوروں اور بے سہارا لوگوں کی تکالیف کا شدت سے احساس تھا۔ وہ عام لوگوں کے جذبات سے بخوبی واقف تھے۔ اس لیے اُن کی شاعری میں عام دلوں کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ مظلوموں کی حمایت میں اُنھوں بے شمار انقلابی نظمیں لکھی ہیں جو ان کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ الطافؔ کے پہلے شعری مجموعہ 'تصویر احساس' کے دباچے میں اُن کی انہی شاعرانہ خصوصیات پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے کرشن چندر لکھتے ہیں:

''الطافؔ کی شاعری میں مظلوموں اور کسانوں کی تکالیف کا احساس شدت کے ساتھ موجود ہے۔ اس کے نغموں میں مظلوموں کی حمایت کا چشمہ ابل رہا ہے اور اس کے شباب کی سرمستیاں اور رعنائیاں وطنی جذبات کی لہروں کے ریلے میں مدغم ہوگئی ہیں۔ وہ دورِ جدید کا شاعر ہے اور آنے والے انقلاب کی ہنگامہ خیزیوں کا علمبردار۔'' ۵؎

الطافؔ اپنے ہم عصر شعرا فیضؔ، جوشؔ، حفیظؔ اور مخدومؔ وغیرہ سے کافی متاثر تھے، اس لیے جب سرمایہ دارنہ نظام کے خلاف آواز بلند ہو رہی تھی تو ایسے میں الطافؔ مشہدی نے بھی قدم آگے بڑھایا اور مزدوروں کی حمایت میں خوب نغمے گائے۔ اس ضمن میں ان کی ایک نظم ''مزدور کی تصویر'' سے چند اشعار ملاحظہ ہو ؎

چشمِ عبرت آدکھاؤں میں تجھے وہ سر زمیں
چومتی ہے جس کی چوکھٹ کو فرشتوں کی جبیں
خشک ٹکڑا بھی جہاں مزدور کو حاصل نہیں
ہے لہو سے جس کے رنگیں اہل زر کی آستیں
محنت و اندوہ و غم شام و سحر جس کی غذا
جگمگاتا ہے پسینہ بن کے بجلی کی ضیاء
جس کی ہے گاڑھی کمائی سود خوروں کے لیے
جس کی جانِ زار ہے سرمایہ داروں کے لیے
جھونپڑوں میں فاقہ کش مزدور ہیں کھوئے ہوئے
یعنی اپنے ہی نصیبوں کی طرح سوئے ہوئے
ترقی پسند تحریک سے وہ بیحد متاثر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے گرد و پیش جو کچھ بھی دیکھا اور محسوس کیا اسے بڑی فن کاری کے ساتھ اپنی شاعری میں پیش کر دیا۔ سلاست اور روانی ان کو قدرت کی طرف سے عطیہ تھیں۔ بے ساختہ پن اور جذبات نگاری ان کے اسلوب کی پہچان ہے۔ وہ بھاری بھرکم تشبیہات و استعارات سے گریز کرتے ہوئے اپنی بات کو بالکل سلیس اور دلنشیں انداز میں بیان کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ اُن کی بعض نظموں کی رنگینی اور دلکشی دل کو موہ لیتی ہے۔ اسی سلسلے کی ان کی ایک نظم ''بہار موسمِ سرما مجھے خراب نہ کر'' بڑی عمدہ نظم ہے۔ نظم ملاحظہ فرمائیں ؎

جب رات کی دیوی بستر سے اٹھ کر انگڑائی لیتی ہے!
آکاش کے ساگر میں قدرت جب چاند کی کشتی کھیتی ہے

فطرت جب نیند کے پریوں کے شانوں کو جنبش دیتی ہے
اس وقت کنارے راوی پر ایک دلکش منظر ہوتا ہے

ساون کے رنگیں موسم میں بدمست گھٹائیں جھومتی ہیں
جب حسن کی حسرت میں نظریں راوی کے کنارے گھومتی ہیں

اور گورے گورے اعضاء کو لہروں میں چھپ کر چومتی ہیں!
اس وقت کنارے راوی پر ایک دلکش منظر ہوتا ہے

اس نظم میں الطافؔ نے دریائے راوی کے کنارے فطرت کے اُن حسین اور دلکش نظاروں کی اپنے جذبات کے ساتھ بہترین عکاسی کی ہے۔ الطافؔ کے نغموں میں امید کی کرنیں تو دکھائی دیتی ہیں پر ایسا لگتا ہے کہ

عیش ونشاط کی سرمستی ان کے حصے میں نہیں۔ وہ اپنے ارمانوں کا خواب سجائے زندگی کی گرب ناکیوں سے نکلنا چاہتے ہیں، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وصل کی خوشی انھیں کبھی میسر نہ ہوئی ہو۔ رنج والم اور سوز وگداز ان کے کلام کا خاص جوہر ہے۔

الطاف مشہدی نے نظموں اور گیتوں کے علاوہ غزلیں بھی کہی ہیں۔ مگر درحقیقت وہ نظم کے شاعر تھے اور نظم ہی کی بدولت معروف بھی ہوئے۔ انھیں غزل سے بیحد نفرت تھی مگر اتفاقاً اُن کے روبرو کچھ ایسا ماجرا درپیش آیا کہ وہ خود ہی غزل کہنے پر مجبور ہوئے۔ اس لیے وہ غزل میں نظم کی سی دلکشی و دلآویزی پیدا نہ کر سکے۔ اپنی غزل گوئی کے تعلق سے الطاف لکھتے ہیں:

''۱۹۴۵ء کا ذکر ہے کہ گوالیار کی ایک مشہور مغنیہ کولمبیا رکارڈنگ کمپنی میں رکارڈنگ کے لیے آئیں۔ میں ان دنوں کولمبیا میں نغمہ نگاری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ میری شاعری کے پانچ مجموعے چھپ چکے تھے۔ یہ سب نظموں اور گیتوں پر مشتمل تھے۔ غزل سے مجھے گھن سی آتی تھی۔ گوالیاری مغنیہ کے گلے میں بلا کا رس تھا اور اس کی خواہش تھی کہ میں الطاف کی غزلیں گاؤں۔ حسن جب مچلتی ہوتا ہے تو چٹانیں بھی راستہ دے دیتی ہیں۔ مجھے غزل لکھنا پڑی اور غزل کی گائیکی نے مجھ پر ایسا جادو کیا کہ تب سے اب تک غزلیں بھی کہہ رہا ہوں۔'' ۶؎

یہی وجہ ہے کہ ادبی دنیا میں ان کی غزلوں کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ مگر پھر بھی انھوں نے جو غزلیں کہی ہیں وہ بڑی حد تک کامیاب نظر آتی ہیں ؎

ملا تو مجھ کو ملا یہ صلہ بہاروں سے
لپٹ کے روتا ہوں ویران رہگزاروں سے
ابھی تو اپنی کہانی کوئی نہیں سنتا
سنیں گے ہم بھی فسانہ کبھی ستاروں سے

فریب آرزو دل کھا رہا ہے
مجھے برباد کرکے جارہا ہے
اِدھر آنکھیں پڑی ہیں خشک ویراں
اُدھر رونے کا موسم آرہا ہے

الغرض الطاف مشہدی دبستانِ سیماب کا ایک ایسا معتبر نام ہے جو ایک مدت تک آسمانِ شعروادب پر سایہ فگن رہا۔ جن کے انوکھے بول اور جداگانہ اسلوب کو عوام نے خوب سراہا۔ الطاف نے اپنے شعری سفر کا آغاز گیت گوئی اور نظم نگاری کے ذریعہ کیا اور ایک عرصہ تک اپنی انقلابی شاعری کے توسط سے عوام کے مردہ دلوں میں زندگی کی نئی امنگیں پیدا کرتے رہے۔ وہ دراصل ترقی پسند نظریہ کے حامی تھے اور اسی نظریہ کے تحت انھوں نے شاعری کی اور کہانیاں بھی لکھیں۔ صحافت کے میدان میں بھی قدم رکھا تو عمر کے آخر ایام تک متعدد رسائل وجرائد کی ترویج واشاعت میں منہمک رہے۔ بالآخر ۲۴؍جون ۱۹۸۱ء کو سرگودھا (پنجاب) پاکستان میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ غرضِ کہ الطاف مشہدی نے اپنے فنکارانہ شعور کے تحت شعروادب کی سربلندی کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیا ہے وہ ادبی دنیا کے لیے ایک بہت بڑا اضافہ ہے۔ اس لیے اُن کے اِس عظیم کارناموں کو ادبی دنیا کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

حوالہ جات:

۱۔ ماہنامہ ''بیسویں صدی'' دہلی دسمبر ۱۹۶۴ء، الطاف مشہدی سے انٹرویو از نریش کمار شاد

۲۔ داغ بیل، الطاف مشہدی، عوامی کتب خانہ سرگودھا پاکستان، ۱۹۵۰ء، کور پیج

۳۔ ایضاً

۴۔ ویب: ادبی رسائل رئیس فاطمہ، ڈیلی ایکسپریس اردو محفل فورم

۵۔ تصویر احساس، الطاف مشہدی، اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۳۹ء، ص ۲۱

۶۔ ماہنامہ ''بیسویں صدی'' دہلی دسمبر ۱۹۶۴ء، الطاف مشہدی سے انٹرویو از نریش کمار شاد

☆☆☆

اردو کی ترقی کے لئے اردو کے رسائل واخبارات کو خرید کر پڑھیں
اور
اپنے بچوں کی اردو تعلیم کا انتظام ضرور کریں۔

مستقبل کی آگاہیوں کا چراغ: سرسید احمد خاں

انصاری شاہین عبدالحکیم
(الاتحاد کالج، آر۔ایم روڈ، گلشن نگر، جوگیشوری، ویسٹ ممبئی)

مولانا الطاف حسین حالیؔ نے بہت پہلے سرسید احمد خاں کے مُتعلق یہ شعر کہہ دیا تھا:۔

ترے احسان رہ رہ کر سدا یاد آئیں گے اُن کو
کریں گے ذکر ہر مجلس میں اور دہرائیں گے اُن کو

تقریباً دو صدیاں گزرنے کے باوجود سرسید کو اُسی جوش اور جذبے کے ساتھ بلکہ اُس سے دگنی شدت کے ساتھ صدا دی جارہی ہے اور محسوس کیا جارہا ہے کہ سرسید جیسے مفکر کا عصرِ حاضر میں ہونا بے حد ضروری تھا۔ جس دور میں تہذیب، تعلیم، اخلاقیات، مذہب اور انسانیت وغیرہ کو درکنار کر دیا گیا ہے، اِس دور میں سرسید جیسا مفکر و دانش ور جو پھر سے جلوہ نما ہو کر پورے عالم میں مشعل بردار بن جائے اور انسانیت کو جِلا بخشے۔ سرسید احمد خاں نے تہذیب الاخلاق کے ذریعے ایک مہم چلائی تھی جو مہم آج بھی برقرار ہے۔ مگر اس مہم کی فکر کا جذبہ اب اختتام کے مرحلے پر ہے۔ عوام کی سوچ تبدیل ہو چکی ہے۔ وہ انقلاب، جوش اور جذبہ سب کچھ سطح پر منجمد ہوتا ہوا نظر آرہا ہے جو داغ بیل سرسید نے ڈالی تھی۔ اردو زبان و ادب پر سرسید کے بے شمار احسانات ہیں۔ ان میں سے ایک احسان تہذیب الاخلاق کی صورت تادمِ حال موجود ہے جو اس دور میں بھی کسی نہ کسی سطح پر جاری و ساری ہے مگر افسوس کہ اس کے قدردانوں میں اب وہ جوش باقی نہیں رہا۔ بقول مولوی عبدالحق:

''اُس نے زبان (اردو) کو پستی سے نکالا، اندازِ بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی، سنجیدہ مضامین کا ڈول ڈالا، سائینٹیفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، جدید علوم و فنون کے ترجمے انگریزی سے کروائے، خود کتابیں لکھیں اور دوسروں سے لکھوائیں۔ اخبار جاری کر کے اپنے انداز تحریر، بے لاگ تنقید اور روشن صحافت کا مرتبہ بڑھایا'' تہذیب الاخلاق'' کے ذریعے اردو ادب میں انقلاب پیدا کیا۔''

(مطالعہ سرسید احمد خاں۔ از۔ مولوی عبدالحق۔ ص ۵۹)

سرسید کو کتابوں کا بڑا شوق تھا جس کی وجہ سے اُن کے معیار کی بلندی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کہتے ہیں کہ ''وَخَیرا جلیس فِی الزَّمَانِ الْکِتَابُ'' یعنی: دنیا میں کتاب سے بہترین کوئی ساتھی نہیں'' یہ بات تو سرسید نے ثبوت کے ساتھ پیش کر دی۔ وہ خود اپنے آپ میں مثال قائم کر چکے ہیں۔ اُنھوں نے کتابوں کو اپنا ہم سفر بنایا، آپ کتابیں خود بھی پڑھتے اور دوسروں کو بھی پڑھنے دیتے، اپنے دوستوں کے ساتھ اُن کے والدین اور دیگر

افرادِ خانہ کو بھی پڑھنے کی تلقین کرتے۔ اُنھوں نے اپنے گھر میں لائبریری قایم کر رکھی تھی، اُسی کے ساتھ اُنھوں نے کالج میں لائبریری قائم کی اور دیگر لائبریریوں کو فروغ دینے کے لیے کوشاں رہے۔ اُنھیں سب سے زیادہ جو کتاب پسند تھی وہ تھی ''معلم الطلبا''۔ اُس کا اظہار وہ کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''میرے نزدیک آج تک ایسی مختصر و مفید کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ مجھے یہ کتاب اتنی پسند ہے کہ جب سے آئی ہے میز پر رکھتا ہوں اور ہر روز تھوڑا تھوڑا پڑھ لیتا ہوں اور جب تک اس کے تمام مطالب کا نقشہ بخوبی ذہن میں نہ جم جاوے گا ہمیشہ اس کو پڑھتا رہوں گا۔ میں اپنے دوستوں کو بھی صلاح دیتا ہوں کہ اس کتاب کو پڑھیں، مگر نہ سرسری طور پر، بلکہ ایسے طور پر کہ اس کا نقشہ ذہن میں جم جاوے۔

(معلم الطلبا۔ سرسید کی ایک پسندیدہ کتاب، ماہنامہ تہذیب الاخلاق اکتوبر ۲۰۱۸ء، ص ۲۳)

آج مسلمانوں کا اور بطورِ خاص اردو زبان کا زوال اسی وجہ سے ہو رہا ہے کہ ہم کتابیں نہیں پڑھتے، جس کی وجہ سے ہم تہذیب، مذہب، اخلاقیات اور جذبۂ انسانیت وغیرہ سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور اگر پڑھ بھی لیتے ہیں تو سرسری طور پر جس کے نقوش تو بہت دور کی بات ہے اُس کتاب کا نام بھی یاد نہیں رہتا۔ سرسید نے یہ تحریک بہت پہلے چلائی تھی جس کو اگر ہم تھام کر چلتے تو دورِ حاضر میں ضرور دوسرا سرسید پیدا ہوسکتا تھا۔ اور اردو زبان کو ایک نئی تحریک مل سکتی تھی، مگر افسوس سرسید کی قربانیوں کو ہم نے یک سر فراموش کر دیا۔ سرسید احمد خان کے دو واقعات مختصراً بیان کرتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے کہ اُن کو کتابوں سے کس قدر لگاؤ تھا۔ وہ کہتے ہیں:

''ایک بار خلعت ملنے کی تاریخ پر ایسا ہوا کہ والد بہت سویرے اُٹھ کر قلعہ چلے گئے اور میں بہت دن چڑھے اُٹھا۔ ہر چند بہت جلد گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا مگر پھر بھی دیر ہوگئی۔ جب لال پردہ کے قریب پہنچا تو قاعدہ کے موافق اول دربار میں جا کر آداب بجالانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ داروغہ نے کہا کہ بس اب خلعت پہن کر ایک ہی دفعہ دربار میں جانا۔ جب خلعت پہن کر میں نے دربار میں جانا چاہا تو دربار برخاست ہو چکا تھا اور بادشاہ تخت پر سے اُٹھ کر ہوادار پر سوار ہو چکے تھے۔ بادشاہ نے مجھے دیکھ کر والد سے، جو اس وقت ہوادار کے پاس ہی تھے، پوچھا کہ '' تمہارا بیٹا ہے؟'' اُنہوں نے کہا، ''حضور کا خانہ زاد!'' بادشاہ چپکے ہو رہے۔ لوگوں نے جانا بس اب محل میں چلے جائیں گے، مگر جب تسبیح خانہ میں پہنچے تو وہاں ٹھہر گئے۔ تسبیح خانہ میں بھی ایک چبوترا بنا ہوا تھا جہاں کبھی کبھی دربار کیا کرتے تھے۔ اُس چبوترا پر بیٹھ گئے اور جواہر خانہ کے داروغہ کو کُشتۂ جواہر حاضر کرنے کا حکم ہوا۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ بادشاہ نے مجھے اپنے سامنے بلایا اور کمالِ عنایت سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ '' دیر کیوں کی؟'' حاضرین نے کہا، ''عرض کرو کہ تقصیر ہوئی'' مگر میں چپکا کھڑا رہا۔ جب حضور نے دوبارہ پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ ''سو گیا تھا!'' بادشاہ مسکرائے اور فرمایا، '' بہت سویرے اُٹھا کرو!'' اور ہاتھ چھوڑ دیے۔ لوگوں نے کہا، '' آداب بجالاؤ!'' میں آداب بجا لایا۔ بادشاہ نے جواہرات کی معمولی رقمیں اپنے ہاتھ سے پہنائیں۔ میں نے نذر دی اور بادشاہ اُٹھ کر خاصی ڈیوڑھی سے محل میں چلے گئے۔ تمام درباری میرے والد کو بادشاہ کی اس عنایت پر مبارک سلامت کہنے لگے۔۔۔۔ اُس زمانہ میں میری عمر آٹھ نو برس کی ہوگی۔''

(سرسید احمد خاں حیات اور خدمات۔ از۔ گراہم جورج فرقوہار (۱۸۸۵ء)۔ ص ۴)

دوسرے واقعے کو شیخ محمد عبداللہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''سرسید صبح چار بجے اٹھ جاتے تھے اور اُن کے پلنگ کے پاس جو میز رکھی رہتی تھی، اُس پر ایک موم بتی جلا کر رکھ دیتے تھے اور اُس کی روشنی میں کتابوں کو مطالعہ کیا کرتے تھے یا مضامین لکھا کرتے تھے۔''

(شیخ محمد عبداللہ، مشاہدات و تاثرات، اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص ۱۶۔)

آٹھ/نو برس کی عمر میں سرسید بھی صبح دیر تک سویا کرتے تھے مگر ان میں بچپن ہی سے سچ کہنے کی صلاحیت موجود تھی، جیسے ہی اُنھوں نے کتاب کو اپنا ساتھی بنالیا وہ صبح چار بجے اٹھ

کر موم بتی کی روشنی میں مطالعہ کرنے لگے۔ ایک ہمہ جہت پہلو کا مالک بننا آسان نہیں ہوتا اُس کی رگوں میں مذہبیت کا ہونا ضروری ہے۔ جو سرسید کی رگوں میں بچپن سے ہی موجود تھی، سچائی، مطالعہ، اور صبح سویر اٹھنا۔ دونوں واقعات کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ خِلعَت کہ لیے جو شخص صبح نہیں اٹھ سکا وہ مطالعہ کے لیے صبح سویرے اٹھ کر مضامین پڑھتا، لکھتا اور مطالعہ کرتا ہے۔

سرسید احمد خاں نے انسانیت کا پیکر بن کر ہماری آنکھیں کھولنی چاہیں، وہ چاہتے تھے کہ انسان خودغرضی سے پاک ہو، کینے سے دور ہو، دل بغض سے شفاف، محبت کا مجسمہ، دین کے قریب، تہذیب کا سرچشمہ، اخلاقیات کا سمندر بن جائے، اس لیے اُنھوں نے اپنی زندگی کو اُسی نہج پر گزارنے کی کوشش بھی کی۔ سرسید رقم طراز ہیں:

''سب سے بڑا عیب ہم میں خودغرضی کا ہے اور یہی مقدم سبب قومی ذلّت اور نامہذب ہونے کا ہے، ہم میں سے ہر ایک کو ضروری ہے کہ رفاہِ عام کا جوش دل میں پیدا کریں اور یقین جانیں کہ خود غرضی سے تمام قوم کی اور اُس کے ساتھ اپنی بھی بربادی ہوگی۔''

(سرسید کا پیغام اخلاق۔محمد تنویر، ماہنامہ تہذیب الاخلاق اکتوبر ۲۰۱۹ء، ص ۲۹۶)

ایک مقام پر کہتے ہے:

''گزشتہ زمانوں میں ہمارے بزرگوں کی حالت عمدہ اور بےنظیر تھی۔ گزشتہ زمانے کے سویلائزیشن جسے یاد کر کے ہم کو رونا چاہیے ہمارے بزرگوں کو نصیب تھی۔ اخلاق، محبت، مروت، دوستی، دوستی کا برتاؤ، دوستی کا پاس، دلی نیکی، فیاضی، متانت، چھوٹوں کے ساتھ الفت، بڑوں کا ادب، غریبوں کے ساتھ ہمدردی، قومی یگانگت سب اُن میں جمع تھی۔ قومی تعلیم دینی و دنیوی کا ایسا مستحکم اور قابل ادب سلسلہ تھا جس کی نظیر تمام دنیا کی کسی قوم میں پائی نہیں جاتی۔''

(سرسید کا پیغام اخلاق۔محمد تنویر، ماہنامہ تہذیب الاخلاق اکتوبر ۲۰۱۹ء، ص ۲۹۸)

سرسید تعلیم کے مُتعلِق بے حد فکرمند تھے اُنھیں احساس تھا کہ تعلیم وہ نہیں ہے جو دو چار کتابیں پڑھ کر رٹّا مار کے امتحان دے کر کامیابی حاصل کرلے۔ تعلیم کے نکتۂ نظر پر اُنھوں نے ایک طویل مضمون قلم بند کیا ہے اُن کے ''آخری مضامین'' میں ایک مضمون ہے'' ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم اور گورنمنٹ''، جس میں اُنھوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان میں اعلا تعلیم تو ضرور دی جائے گی مگر رٹی رٹائی۔ اور اُس کا تدارک بھی انھوں نے بتا دیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''اعلیٰ تعلیم صرف چند کتابوں کے پڑھ لینے اور طوطے کی طرح یاد کر لینے اور امتحان دیدینے اور انگریزی میں (ایک آدھ جملہ۔آٹی ٹلی ٹیل) بول لینے سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے لیے سب سے بڑی تعلیم دینے والی عمدہ سوسائٹی ہے۔ جس کا وجود ہندوستان میں نہیں ہے اور شاید صدیوں تک ابھی نہیں ہونے کا۔ ایک دانشمند کا قول ہے کہ انگلستان میں بچوں اور طالب علموں کو کتاب پڑھنے سے اس قدر تعلیم نہیں ہوتی جس قدر کہ کان اور آنکھ سے ہوتی ہے۔''

(ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم اور گورنمنٹ، آخری مضامین۔سرسید احمد خاں، ص ۲۳)

غالباً سرسید کا خیال تھا کہ ہندوستان میں بھی ایسی تعلیم دی جائے جو کان اور آنکھ سے ہوتی ہو۔ اُس وقت قدرتی مناظر دکھا کر، حقیقت پر مبنی آنکھوں دیکھے مناظر دکھا کر سنا کر تعلیم دینا ہوگا مگر ہندوستان میں ممکن نہ ہوسکا۔ دورِ حاضر میں مصنوعی ذرائع سے تعلیم آنکھوں اور کانوں سے دی تو جارہی ہے مگر وہ فکرِ تعلیم نہیں رہی جو سرسید چاہتے تھے۔ وقت وقت کی بات ہے۔

سرسید نے اُس دور میں بہت سی باتیں ایسی کہیں جو آج کے دور میں بھی منطبق ہوتی ہیں۔ اُن کی فکر کی سوچ کی لہریں اِس قدر اونچی تھیں کہ اُنھوں نے نہ صرف تعلیم، مذہب، تہذیب، اخلاقیات، سائنسی علوم اور ہندوستان کے حالات کو نمایاں کیا بلکہ سرسید نے کسانوں کے لیے تک اپنی فکر ظاہر کی ہے۔ دورِ حاضر میں کسانوں کے جو حالات ہیں اُن کی واقفیت اُن کو اُس وقت بھی تھی اور اِسی لیے اُنھوں نے کسانوں کے لیے راستے ہموار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اِس کے مُتعلِق ڈاکٹر محمد کلیم ضیاؔ لکھتے ہیں:

''سر سید نے مسلمانوں کی ترقی اور ہندوستان اور ہندوستانیوں کی ترقی کے لیے متوازی کوششیں کیں۔ اُن کا مقصد

صرف مسلمانوں کی ترقی ہی نہیں تھا بلکہ ملک و قوم کی متوازی ترقی ہی میں وہ مسلمانوں کی ترقی کو مُضمِر سمجھتے تھے۔ سرسید نے اس کے لیے ہندوستانیوں کو مشورہ دیا اور ساتھ ساتھ حکومت کو بھی کہ زرعی میدان میں جدید آلات اور طریقے رائج کیے جائیں تاکہ ملک زرعی ترقی میں بھی آگے بڑھیں وہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کا بڑا طبقہ گاؤں میں آباد ہے جس کا ذریعۂ معاش زراعت پر منحصر ہے اس بات کو سرسید کی روشن خیالی سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ سرسید نے معاشرتی اور تعلیمی اصلاح کی تحریک کی ابتدا ہی ہندوستانی زراعت کی ترقی کے منصوبوں اور تدابیر سے کی تھی۔''

(مصلح قوم و ملت۔سرسید احمد خاں۔از۔ڈاکٹر محمد کلیم ضیاؔ)

سرسید احمد خان کی زندگی کے جتنے پہلوؤں کو اُجاگر کیا جائے، کم ہے، وہ خود میں ایک دبستان، ایک انجمن، ایک داستان، ایک مثنوی، ایک ناول، ایک افسانہ، ایک خط، ایک غزل اور ایک نظم وغیرہ اصناف کی طرح ہیں، جب بھی سرسید کو پڑھا تو لگا ایک انجمن کی سیر ہو رہی ہے، ایک دبستان کو دیکھا جا رہا ہے، ایک مثنوی کی طرح طویل اور خوب صورت اشعار پر مبنی مختلف پہلو اجاگر ہو رہے ہیں، ایک ایسی داستان سنائی جا رہی ہے جو ہر موڑ پر الگ تحریک چلا رہی ہے، ایک ایسا افسانہ جو ماضی، حال اور مستقبل کی حقیقت کو پیش کر رہا ہے۔ ایک ایسا خط جس میں نہ صرف خرد قوم کا بلکہ انسانیت کا درد محسوس ہوتا ہے، ایک ایسی غزل جس کا ہر شعر مکمل بیانی کرتا ہے، ایک ایسی نظم جو آبشار کی آواز سے دل و دماغ کے رگیں کھول رہی ہیں۔ حتیٰ کہ مشرق سے مغرب تک کا طویل سَفَر موحولیات کی جھلکیاں دکھا رہا ہے ان کے ہر رُخ کو دَھنک کے رنگوں کی طرح درشاتا ہے، دل، دماغ، روح اور ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

شے گان※وں، ضلع بلڈانہ مہاراشٹر کے ایک مفکر اور مدرس جناب حول دار سلیم الدین عامرؔ نے سرسید احمد خاں کی وفات پر تاریخِ رحلت رقم کی ہے یہ قطعہ تقریباً دس اشعار پر مشتمل ہے۔ میں یہاں صرف تین اشعار درج کر رہی ہوں جس میں ایک شعر میں ''تین الفاظ پر مشتمل تاریخِ رحلتِ سرسید ہے۔ وہ الفاظ ''نبضِ دوراں پر'' ہیں۔ ؎

ہمدرد تھے قوم ملّت کے بھارت کے سپوت تھے احمد خاں
کرتا ہے جن پر فخر بجا اے دوستو سارا ہندوستاں

اُنگشت وہ اپنی رکھتے تھے ہر آن جو ''نبضِ دوراں پر''
تشہیر علومِ عصری کا پھر کیوں نہ اُٹھاتے بارِ گراں

اوصافِ حمیدہ کی اُن میں موجود تجلّی تھی ورنہ
بے نور چراغوں پر عامرؔ پروانے لُٹاتے ہیں جان کہاں

آئیے کچھ شعرا کے کلام سے ان کے مختلف پہلوؤں کو محسوس کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مولوی نظیر احمد کیا کہتے ہیں سماعت فرمائیے:

وہ اپنے وقت کا اک فرد کامل بلکہ اکمل تھا
کہ ہم میں کا ہر اک اعلیٰ اس سے اسفل تھا

مندوں کی صف میں سب موخر تھے وہ اول تھا
غرض اسلامیوں کی فوج کا لیڈر تھا جنرل تھا

اب اس کے بعد لشکر ہے مگر افسر نہیں کوئی
بھٹکتا پھر رہا ہے قافلہ رہبر نہیں کوئی

اکبرؔ الہ آبادی جو زندگی بھر سرسید کے مخالف رہے، سرسید کی وفات پر یوں رقم طراز ہیں:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو اس کو جو کچھ فرق ہے کہنے میں کرنے میں

یہ دنیا چاہے جو کچھ بھی کہے اکبرؔ یہ کہتا ہے
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

صبا اکبر آبادی نے خراجِ تحسین یوں پیش کی ہے:

تہذیب اور اخلاق سِکھانے والا
سُورج کی طرح سے جگمگانے والا سید
کی زبان کا اثر تھا اتنا
ہر لفظ دلوں میں تھا اُترنے والا

اِک صاحبِ ہوش، راہبر تھے سید
اسلام کی چشمِ معتبر تھے سید

میں اپنی گفتگو ڈاکٹر محمد کلیم ضیاؔ کے ایک قطعے پر ختم کرتی ہوں جس کا بھی یہاں پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔ وہ کہتے ہیں:

ادب شعور کے سانچے میں ڈھال کر ہم نے
جدید طرز سے کُہنہ رِواج بدلا ہے
ادب کو حُسنِ حقیقت سے آشنا کر کے
ادب کے حُسن کا ہم نے مِزاج بدلا ہے

☆☆☆

''نظر نظر منظر'': ایک جائزہ

(منظر صدیقی کا شعری مجموعہ)

ڈاکٹر احسان عالم
پرنسپل الحراء پبلک اسکول، دربھنگہ، موبائل :9431414808

محمد منظر الحق صدیقی اپنے قلمی نام منظر صدیقی سے مشہور ہیں۔ ان کی پیدائش ۷/ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو محلہ باقر گنج، لہریا سرائے، دربھنگہ میں ہوئی۔ وہ ڈبل ایم اے، ایل ایل بی ہیں۔ بہت سے لوگوں کے کام آنا ان کا ایک مشغلہ ہے۔ ایک لمبے عرصے سے دربھنگہ کے ایک معروف ادارہ ''بزم رہبر'' کے رکن ہیں۔ فی الحال وہ بزم رہبر کے سکریٹری ہیں۔ ایک طویل عرصہ سے شاعری کر رہے ہیں۔ اپنی غزلوں کو یکجا کر کے انہوں نے ''نظر نظر منظر'' کے نام سے کتابی صورت عطا کی ہے۔

پیش نظر کتاب ''نظر نظر منظر'' کے لئے پانچ نامور ادیبوں اور شاعروں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں پروفیسر رئیس انور رحمن، ذکی احمد، ڈاکٹر عبدالمنان طرزی، منیر سیفی اور ڈاکٹر قیام نیر ہیں۔ ان حضرات کے تاثرات کے قبل ''اپنی بات'' عنوان کے تحت منظر صدیقی لکھتے ہیں:

''شاعری اپنے منصب و مقام سے گر جاتی ہے اگر یہ دل کی لگی کے بجائے مشغلہ دل بن جاتی۔ عصر حاضر کی شاعری میں خون جگر کی جگہ نعرہ بازی اور سیاسی پروپگنڈا کا عنصر جا بجا ملتا ہے جس سے فن کا نقصان ہوا ہے۔ جہاں تک میری شاعری کا تعلق ہے تو میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ اس میں فنی خوبیاں ہیں لیکن صرف ایک شئے کا ذکر مقصود ہے اور وہ صرف یہ ہے کہ جو کچھ حالات و واقعات کے وسیلہ سے زندگی نے دیا بس اسی کو شعری قالب میں ڈھالنے کی کوشش گزشتہ چار دہائی سے زیادہ عرصہ سے کر رہا ہوں۔''

پروفیسر رئیس انور رحمن (سابق صدر شعبہ اردو، ایل۔ این۔ ایم، یو، دربھنگہ) ایک معروف ناقد اور محقق کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انہوں نے منظر صدیقی کی کتاب پر اپنے تاثرات کا اظہار بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ ان کی شخصیت پر قلم فرسائی کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''جناب محمد منظر الحق صدیقی جو اپنے قلمی نام منظر صدیقی سے پہچانے جاتے ہیں، اسی ادبی ماحول کے پروردہ اور متحرک رکن ہیں۔ موصوف ایک مذہبی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ کم عمری میں والد کی وفات سے انہیں خاصی جدوجہد کرنا پڑی۔ نامساعد حالت میں بھی وہ دینی اور دنیاوی دونوں سطحوں پر تحصیل علم میں مصروف رہے۔ بڑی مشقت سے اردو اور سماجیات میں پوسٹ گریجوئٹ ہوئے، نیز قانون اور لائبریری سائنس کی ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ دنیاوی علوم میں منہمک ہونے کے باوجود انہوں نے صوم وصلوۃ اور دیگر دینی فرائض کی ادائیگی میں کبھی غفلت نہیں برتی۔ پینتالیس چھیالیس سال کی عمر میں اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔''

بزرگ ادیب و شاعر ذکی احمد چندن پٹوی نے منظر صدیقی کی نذر ایک منظوم تاثرات تحریر کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں:

'بزم رہبر' میں ملے جب حاجی منظر ایک بار — ملتے ہی دل ہو گیا ان کی محبت کا شکار
ظاہر و باطن میں منظر کے نہیں کوئی تضاد — ان سے ملنے کے لئے دل چاہتا ہے بار بار
بردباری، خاکساری، دین داری، سادگی — غور سے دیکھیں تو ان میں خوبیاں ہیں بے شمار

(۴۵) ادبی نشیمن ـــ

عالمی شہرت یافتہ شاعر اور صدر جمہوریہ ہند سے اعزاز یافتہ پروفیسر عبدالمنان طرزیؔ نے ''منظر صدیقی'' کے عنوان سے اپنے منظوم تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شاعری سے رشتہ ہے گہرا بڑا
طے سفر افسانوی بھی ہے کیا
زینتِ بزمِ سخن بن کے رہے
شاعری بھی خوب ہی کرتے رہے
صاف و سادہ ہوتا ہے طرز بیاں
جن میں ہوتے وارداتِ دل نہاں

منیر سیفی صاحب نے منظر صدیقی کی کتاب ''نظر نظر منظر'' پر قطعات تاریخ طبع تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

نظر نظر منظر ہے مطبع میں لیکن
چرچا اس کا محفل محفل جاری ہے
بلبل و قمری نے مل کر تاریخ کہی
''غزل چمن ہے، ہر مصرع پھلواری ہے''

۲۰۱۹ء

معروف ادیب ڈاکٹر قیام نیر (سابق صدر شعبہ اردو، این جے مہیلا کالج، دربھنگہ) نے منظر صدیقی کے فن پر مختصر لیکن جامع تحریر رقم کیا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''منظر صدیقی بزم رہبر کی ماہانہ نشست میں ہر ماہ شامل ہوکر اردو شاعری میں اپنا نام روشن کر چکے ہیں لیکن وہ افسانے بھی لکھتے رہے ہیں۔ ان کے کئی افسانے ملک کے مختلف رسائل جیسے ''گلابی کرن، جہاں نما، آوازنو، خاتون مشرق، وغیرہ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ ''چاندسی محبت'' خاتون مشرق ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد رک رک کر افسانے لکھتے رہے۔ ''آغوش محبت، راکھی کے دن اور ایک خط'' وغیرہ ان کے اچھے افسانے ہیں۔''

دیگر اکثر مجموعوں کی طرح منظر صدیقی نے بھی اپنے کتاب کی شروعات حمد و نعت پاک سے کی ہے۔ دو اشعار کے حمدیہ کلام میں وہ لکھتے ہیں:

زباں پہ رکھئے سدا لا الہ الا اللہ
کلام حق ہو ادا لا الہ الا اللہ
ہے دین و دنیا کی اس میں بھلائی اے منظرؔ
اسی پہ دل ہے فدا لا الہ الا اللہ

اپنے نعتیہ کلام میں منظر صدیقی صاحب سرکار دو عالم ﷺ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

نبیوں میں اعلیٰ مقام اللہ اللہ
محمد پہ لاکھوں سلام اللہ اللہ
ہے دونوں جہاں کے لیے شافی کافی
محمد کا پیارا پیام اللہ اللہ

اس کے بعد پوری کتاب غزلیہ اشعار سے مزین ہے۔ اپنی پہلی غزل میں شاعر فرماتے ہیں کہ ہمارے عہد کے مسیحاؤں نے ایسے زخم دیئے ہیں جن کا دکھانا ممکن نہیں۔ زمانے نے ہمیں ایسا زخم دیا ہے کہ ہم مسکرانے کے قابل بھی نہیں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں:

ہمارے عہد کے خنجر نما مسیحاؤ!
جو زخم تم نے دیئے ہیں دکھا نہیں سکتے

شاعر کے دل میں کوئی گوشہ محبت کے لئے بھی مخصوص نظر آتا ہے تبھی تو وہ کہتے ہیں کہ جتنا پیار میں تجھ سے کرتا ہوں اتنا ہی پیار اگر تم مجھ سے کرو تو ایک دوسرے پر پورا اعتبار حاصل ہوجائے گا۔ شاعر اپنے محبوب کی تلاش میں کافی پریشان نظر آتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ

اگر تیری گلی سے میرا گزر نہیں ہوتا تو مجھ پر پتھروں کی بارش نہیں ہوتی۔ ملاحظہ کریں چند اشعار:

ہمیں ایک دوسرے کا تبھی اعتبار ہوتا
مجھے تم سے پیار ہوتا تمہیں مجھ سے پیار ہوتا

حسن و عشق کی حسین وادیوں میں بھٹکتے ہوئے وہ کچھ خاص لمحوں کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں، تبھی تو وہ فرماتے ہیں:

ہم مست جوانی کے کیونکر نہ مزے لوٹیں
آخر ہمیں دنیا سے اک دن ہے گزر جانا
تم جیسے حسینوں کی فطرت کے مطابق ہے
ایام جوانی میں چہرے کا نکھر جانا

چند قدم آگے بڑھنے کے بعد ہی شاعر ہر خاص و عام کو کچھ پیغام دیتے نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک انسان کا کام دوسرے انسان کو حق بتانا ہے۔ وہ راہ حق پر آئیں یا نہ آئیں لیکن آپ کا فرض ہے کہ انہیں حق کا پیغام ضرور دیں۔ اس نوعیت کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

آئینہ دکھانا ہے دکھاتے رہئے
حق زمانے کو بتانا ہے بتاتے رہئے
ان کی مرضی ہے پئیں یا نہی پئیں جام ولا
آپ کا کام پلانا ہے پلاتے رہئے

اپنی ایک غزل کے ذریعہ شاعر نے وطن پرستی کا پیغام بھی دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جشن آزادی ہمیں دھوم دھام سے منانی چاہئے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے ہمیں اپنے ملک عزیز بھارت کی شان بڑھانا چاہئے۔ گاندھی، آزاد، نہرو کے پیغام کو دنیا تک پہنچانا ہمارا فریضہ ہے۔ وہ اپنے احساسات و جذبات کی ترجمانی کچھ اس طرح کرتے نظر آتے ہیں:

جشن آزادی کا اپنی ہم مناتے جائیں گے
ہر قدم پر شان بھارت کی بڑھاتے جائیں گے
گاندھی و آزاد، نہرو اور موتی لال کے
کارنامے ساری دنیا کو سناتے جائیں گے

اس طرح منظر صدیقی کے شعری مجموعہ ''نظر نظر منظر'' میں کئی نوعیت کی غزلیں ہیں۔ چند غزلیں گنگنانے پر مجبور کرتی ہیں۔ امید ہے قارئین اس کتاب کو پسند کریں گے۔

☆☆☆

حافظ الملک حافظ رحمت خاں اور ان کے کارنامے

زرغونہ خاں

(ریسرچ اسکالر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی)

نواب محبت خاں کے والد بزرگوار کی پیدائش 1708ء ہے۔ چار سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ مگر جب وہ عقل وشعور کو پہونچے تو اپنی ہوشیاری اور حوصلہ مندی سے لاہور و دہلی کے درمیان تجارت شروع کر دی۔ اس بیچ روہیل کھنڈ میں نواب سید محمد علی خاں کی شہرت سن کر ان کی جماعت میں شامل ہو گئے۔ نواب سید محمد علی خاں نے حافظ رحمت خاں کے لئے روہیل کھنڈ میں ایک علاقہ جس میں بارہ گاؤں تھے تجویز کئے حافظ رحمت خاں نے اسے خوشی سے قبول کر لیا۔ اس طرح دونوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کی بنیاد پڑ گئی۔

حافظ رحمت خاں ایک جری انسان تھے، حوصلہ مندی ان کی پیشانی سے ظاہر تھی۔ اقبال مندی نے ان کو نواب محمد علی خاں کے طرف لا کھڑا کیا۔ آہستہ آہستہ ان کا نام محمد علی خاں سے وابستہ ہو گیا جیسے کیکاد ران کے ساتھ رستم کا نام۔

روہیل کھنڈ کی تاریخ میں حافظ رحمت خاں کے کٹھیر آنے کے بارے میں یوں لکھا ہے کہ جب نواب سید محمد علی خاں بانسٹھ کے میدان کی جنگ سے واپس آئے تو انھوں نے دیکھا کہ اکثر روہیلے متفنی ہونے کی وجہ سے ان کی اطاعت سے گریزاں رہتے ہیں، اس پر اپنے مشیروں سے مشورہ کر کے حافظ رحمت خاں ابن شاہ عالم خاں کو روہؔ سے بلایا اس لئے کہ ان کی فرمانبرداری سے روہیلے منھ نہ موڑیں گے۔ اس طرح نواب محمد علی خاں نے متواتر خطوط لکھ کر حافظ رحمت خاں کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ ان کی طرف سے مسلسل اصرار و اشتیاق بھرے خطوط دیکھ کر وہ کھٹیر آ گئے تو سید محمد علی خاں سے ان کی پذیرائی اور قدر و منزلت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی اور ان کے مصارف کے لئے کچھ گاؤں عنایت کئے ساتھ ہی وعدہ کیا کہ آئندہ جو گاؤں قبضے میں آئیں گے دو اور نذر کئے جائیں گے۔ ان کے اس برتاؤ اور خلوص سے متاثر ہو کر انھوں نے روہؔ سے اپنے دیگر متعلقین کو بھی یہاں آنے کی دعوت دی۔ اس طرح یہ سب نواب صاحب کی رفاقت میں رہنے لگے۔ اخیار حسن کے بیان کے مطابق نواب سید محمد علی خاں کو ہِ دانش اور صاحب تدبیر تھے، ان کی نکتہ دانی اور چھوٹی چھوٹی چالیں ایسی ہوتی تھیں کہ دوسرے دیکھتے رہ جاتے۔

اگر چہ حافظ رحمت خاں کی آمد متعدد تاریخوں سے اس سے پہلے ثابت ہے۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ حافظ رحمت اٹھارہ سال تک نواب صاحب کی رفاقت میں رہے۔ نواب سید محمد علی خاں کا انتقال 1162ھ میں ہوا۔ سنہ مذکور سے اٹھارہ سال نکال دیئے جائیں تو 1144ھ حافظ رحمت خاں کی آمد کا سال قرار پاتا ہے۔

اخیار حسن کے بیان کے مطابق حافظ رحمت خاں پہلی بار نواب صاحب کی خدمت میں آئے اور کچھ مدت نواب صاحب کی عنایات سے

فیضیاب ہوکر لوٹ گئے اور تو رشہامت اپنے وطن میں شادی کر کے دوبارہ واپس آ گئے دونوں کی ملاقات ہوئی اور پھر مستقل یہیں رہ گئے۔

تاریخ مظفری کے بیان کے مطابق حافظ رحمت خاں نے کچھ مدت صفدر جنگ کے یہاں بھی ملازمت کی۔

حافظ رحمت خاں نے لکھا: جب میرے والد اور چچاؤں نے ہندوستان میں رہنا پسند کرلیا تو ان کے پیچھے میں بھی یہاں چلا آیا اور مستقل سکونت اختیار کر لی۔

اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ نواب سید محمد علی خاں کی ریاست کی بنیاد کی مضبوطی میں ایک پتھر حافظ رحمت خاں کی ذات بھی ہے۔ ان کی جاں فشانی، خدمت اور حسنِ تدبیر اور دلیرانہ کارنامے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ روہیلوں کی شاندار ریاست کے قیام میں حافظ رحمت خاں کا نام سنہرے حروف سے تاریخ کے صفحات پر لکھا ہوا ہے۔

حافظ الملک حافظ رحمت خاں نے خلاصۃ الانساب میں لکھا ہے کہ ہمارے مورثِ اعلیٰ کا نام شہاب الدین خاں ہے، لقب شیخ کوٹہ تھا۔ کوٹہ کتے کو کہتے ہیں۔ آپ کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے حد سے زیادہ محبت وعقیدت تھی اس لئے بطور انکساری اپنے کو کوٹہ مشہور کیا یعنی پیغمبرِ خدا کا کتا اور اس طرح یہ کٹے بابا مشہور ہو گئے۔

قندھار کے علاقے میں موضع پشین اور شوراوک بڑیچ ان کے رہنے کا علاقہ تھا وہیں سے شہاب الدین خاں ترکِ وطن کر کے اٹک اور ننگر کوٹ کے علاقہ میں آ کر آباد ہو گئے۔ اس طرح کٹے بابا کبھی ضلع ہزارہ میں رہتے اور کبھی چملہ میں اور کبھی علاقہ نمّہ میں۔ سبب یہ ہے کہ پہلے ہی سے قوم بڑیچ کے اکثر خاندان یہاں آ کر آباد ہو چکے تھے۔ شہاب الدین خاں کو سلسلۂ قادریہ سے بیعت تھی، علاقہ حجّہ ہزارہ میں ان کا انتقال ہوا وہیں شاہی ویر کے نزدیک دفن ہوئے۔

زندگی میں اکثر کرامات ظاہر ہوئیں اور مرنے کے بعد ان کی قبر کے اردگرد خندوبوس کے درخت ہیں جو شخص ان درختوں کو نقصان پہونچاتا ہے خود نقصان میں پڑ جاتا ہے۔ شہاب الدین خاں کے لقب کوٹہ کی وجہ سے ان کا خاندان کوٹہ خیل بھی کہلاتا ہے۔ یہ دولت خیل کی شاخ ہے اور دولت خیل بدل بڑیچ کی اولاد ہیں۔

شہاب الدین خاں کے تین بیٹے تھے: پائی، آدم اور محمود۔ محمود خاں عرف موتی خاں ترکِ سکونت کر کے تورشہامت میں جا بسے، ان کے یہاں پانچ بیٹے ہوئے انہیں میں ایک شاہ عالم خاں تھے۔

ہمیں یہاں صرف شاہ عالم خاں کا ذکر مقصود ہے۔ حافظ رحمت خاں کا کہنا ہے کہ شاہ عالم خاں شہید بن موتی خاں سے میرے سوا کوئی بیٹا زندہ نہیں بچا جو موضع تو رشہامت میں سکونت پذیر تھے۔

نواب محمد علی خاں کے ساتھ حافظ رحمت کی جانفشانی کی داستانیں تاریخ روہیل کھنڈ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ تاریخ اودھ نجم الغنی خاں عماد السعادت تاریخ اودھ موسومہ قید التواریخ کمال الدین حیدر۔

ہم دھیرے دھیرے اپنے اصل مقصد کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ نواب محمد علی خاں کو مختلف امراض نے گھیر لیا تھا، ایسی حالت میں انتظامِ سلطنت کی طرف متوجہ ہوئے، ان کے دو بیٹے قندھار میں احمد شاہ ابدالی کے پاس تھے باقی چار بیٹے کم سن تھے جو انتظامِ سلطنت نہیں سنبھال سکتے تھے۔ نواب صاحب بڑے دور اندیش تھے، آگے پیش آنے والی باتوں کو سمجھ لیا کرتے تھے۔

نواب صاحب نے اپنے افسروں اور ہمکاروں کی موجودگی میں اپنی پگڑی اتار کر حافظ رحمت خاں کے سر پر رکھ دی۔ حافظ رحمت صاحب شریف النفس انسان تھے، وہ رونے لگے اور پھر اس پگڑی کو اپنے سے اتار کر سعداللہ خاں کے سر پر رکھدی جو نواب صاحب کے تیرہ سالہ فرزند تھے۔ نواب صاحب اس بات سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اگر سید عبداللہ خاں قندھار سے واپس آ جائیں تو یہ پگڑی اس کے سر پر رکھ دینا۔

اس طرح نواب صاحب نے اپنے تمام

ارکانِ دولت کے مشورہ سے سعداللہ خاں کو اپنا قائم مقام کیا اور حافظ رحمت خاں کو مدارالمہام بنایا اور دوندے خاں حافظ رحمت خاں کے چچا زاد بھائی کو تمام افواج کا سپہ سالار بنایا کہ ان کے دونوں بھائی دوندے خاں اور صلابت خاں ان کے کاموں میں مشیر رہیں۔

اس کے بعد بہ آواز بلند یہ اعلان کیا گیا کہ سید عبداللہ خاں اور سید فیض اللہ خاں کی واپسی تک سعداللہ خاں حکمراں رہیں گے۔

قصہ مختصر 3 شوال 1162ھ 14 ستمبر 1749ء کو نواب محمد علی خاں کا آنولے میں انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ چند برس بعد حافظ رحمت خاں نے ایک شاندار مقبرہ تعمیر کروایا جو اب تک ان کی یادگار ہے۔ خانفرادہ کاظم خاں شیدا نے "ہے ہے افغان" سے مادۂ تاریخ نکالا۔

اب ہم واقعات کو زیادہ طول نہ دیتے ہوئے اپنے اصل موضوع سے متعلق سیر المتاخرین جو لکھنؤ میں لکھی گئی اس کے حوالے سے نواب محبت خاں پسر حافظ رحمت خاں سے متعلق جو ہمارے موضوع سے تعلق رکھتا ہے اور جو حافظ رحمت خاں کی شہادت کے بعد پیش آنے والے واقعات سے تعلق رکھتا ہے۔

سیر المتاخرین کا مؤلف بیان کرتا ہے:

فقیر اکثری ازا ولاد حافظ رحمت خاں ودوندے خاں رادر لکھنؤ بعد مردن شجاع الدولہ درزمان شروع امارت پسرش آصف الدولہ دیدہ واحوال آنہا مشاہدہ واستماع از معتمدین ادراک نمودہ اشرف وافضل جماعت مذکور محبت خاں پسر حافظ رحمت خاں برادر صغیر عنایت خاں کہ باشجاع الدولہ مخلص ومعین شجاع الدولہ بود مشاہدہ گشت بحسب صورت وسیرت لیاقت سروری ودولت مندی داشت۔

مگر سیر المتاخرین کا بیان نواب محبت خاں کی دلی کیفیات ورنج وغم سے مطابقت نہیں رکھتا، ان کے اشعار کی دلسوزی اور اشعار پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ محبت خاں برائے درد خلق شدہ بود و درد برائے او۔

وہ اردو اور فارسی کے شاعر تھے، صاحبِ علم و ہنر تھے، پشتو، اردو اور ترکی کا لغات بھی تیار کیا تھا، گویا وہ شاعرِ مظلومِ جہاں تھے، ان کے کلام میں ہمیں جگہ جگہ درد وغم کی عکاسی نظر آتی ہے جو کچھ ان کے والد شہید کے ساتھ شجاع الدولہ اور انگریزی فوجوں کی مشترکہ چڑھائی نے کیا تھا، ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے والد بزرگوار کا سر کاٹا گیا پھر دربار میں رکھا گیا تھا۔

مولوی مُدن شاہ جو اس وقت کی بزرگ ترین ہستی تھی ان کو دربار میں طلب کر کے شجاع الدولہ نے ان سے سوال کیا: جانتے ہو یہ سر کس کا ہے؟ انھوں نے ان کی ریشِ مبارک کی مٹی صاف کر کے فرمایا: یہ اسی مردِ مومن کا سر ہے جسے دنیا حافظ رحمت خاں کے نام سے جانتی ہے۔ اُن کی اس دلیری اور بے باکی سے متاثر ہو کر رام پور کے کسی شاعر نے کہا تھا ؎

ہزار شیخ نے داڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مُدن کی سی

اگرچہ اس دور کے زیادہ تر شاعروں کے یہاں خارجی درد نظر آتا ہے مگر نواب محبت خاں کا درد دردِ دروں ہے جو ایک غم خانہ میں تبدیل ہو کر غریب الوطنی اور عظمتِ رفتہ کی یاد گار کا پیکر بن کر شعر کی شکل میں ڈھل گیا ہے ؎

صیاد گر ز باغ جدا گشتہ ام چہ غم
از خونِ خود قفس شدہ رنگِ چمن مرا

یہ شعر ان کے دل کی اندرونی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔

نواب محبت خاں محبت شہباز جنگ جو شاعر وادیب وادب نواز اور شاعروں کی عزت وتکریم کرنے والے تھے جس کسی گواہی اس وقت کے تذکرہ نگاروں نے کھلے دل سے دی ہے اور تذکروں میں ان کی صفات عالیہ کا ذکر کیا ہے۔ ہماری اس تمہید کا اصل موضوع ہیں۔ شائد ایسے ہی پٹھان شاعروں کے بارے میں کسی نے کہا ہے ؎

بلند و پست عالم کا بیاں تحریر کرتے ہیں
قلم ہے شاعروں کا یا کوئی رہرو ہے بیہڑ کا

حوالہ:

حیاتِ حافظ رحمت خاں، از: سید الطاف علی بریلوی، ناشر: آل پاکستان کراچی، سن اشاعت: ۱۹۳۳

☆☆☆

انٹرویو

ایک معیاری مقالہ لکھنا بھی کبھی کبھی ایک کتاب لکھنے کے مساوی ہوتا ہے: پروفیسر مقبول

مصاحبہ کار: **چاندا کبر**

ایڈیٹر ''گھومتا آئینہ'' (گلبرگہ) موبائل: 9448577466

چاندا کبر گلبرگہ کے سینئر جرنلسٹ اور برقی جریدہ ''گھومتا آئینہ'' کے ایڈیٹر ہیں۔افسانہ نگار اور خاکہ نگار ہیں۔ان کے خاکوں کا مجموعہ ''چاہے جانے والے'' شائع ہو چکا ہے۔اچھے مصاحبہ کار ہیں۔ مشاہیر زبان وادب سے کیے گئے ان کے مصاحبوں پر مشتمل کتاب عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ادارہ ادبی نشیمن کے لئے انھوں نے پروفیسر مقبول احمد سے گفتگو کی۔ہم ان کے شکر گزار ہیں۔پیش ہے پروفیسر مقبول احمد سے ان کی مکمل بات چیت:

سوال(۱): آپ کا پیشہ درس وتدریس ہے اور شوق شاعری۔۔ ۔دونوں میدانوں میں آپ کا سفر طویل عرصے سے جاری ہے، یہ تو سب جانتے ہیں۔۔۔یہ نہیں جانتے کہ آپ کس طرح توازن برقرار رکھ کر ثابت قدم رہے اور نام کمایا۔

جواب: میں پچھلے اکیس برسوں سے درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ ہوں جب کہ میری شعر گوئی کا مشغلہ ۱۹۸۱ء سے جاری ہے۔ ۱۹۸۴ء سے میری غزلیں اخبارات ورسائل میں شائع ہورہی ہیں۔اس طرح شعروسخن سے میری وابستگی کا دورانیہ چالیس برسوں کو محیط ہے۔یعنی تدریسی مشغلے سے شعر گوئی کے مشغلے کی عمر دوگنی ہے۔تدریس میرا پیشہ یعنی فرضِ منصبی ہے اور شاعری میرا شوق ہے۔ جہاں تک ان دونوں میدانوں میں توازن برقرار رکھنے کی بات ہے تو مجھے یہ کہنے دیجیے کہ سارا معاملہ دیانت داری اور فرضِ منصبی کے

پروفیسر مقبول احمد مقبول ایک ہمہ جہتی شخصیت کے مالک فنکار ہیں۔انھوں نے کئی اہم موضوعات پر خاطر خواہ انداز میں داد تحقیق دی ہے۔ذیل کی مختصر توقیت سے ان کی شخصیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ادارہ ادبی نشیمن ان کی صحت و عافیت اور درازیِ عمر کے لیے دعا گو ہے:

* نام: محمد مقبول احمد * قلمی نام: مقبول احمد مقبول
* مقامِ پیدائش: چنکوپہ، ضلع بیدر، کرناٹک (انڈیا)
* تاریخِ پیدائش: یکم جنوری 1965
* ادبی زندگی کا آغاز: 1981
* تعلیم: ایم۔اے (عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد)، ایم۔فل؛ پی ایچ ڈی (حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی حیدرآباد)
پی جی ڈپلوما (ماس کمیونیکیشن اینڈ ٹرانسلیشن) حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی
پیشہ: تدریس * منصب: پروفیسر شعبۂ اردو * مشاغل: شاعری، تحقیق، تنقید نگاری، تبصرہ نگاری، تصنیف وتالیف
* پسندیدہ اصناف: غزل، رباعی، قطعہ، نظم

تصانیف: 1) مضطر مجاز: شخصیت اور فن (تحقیق) 2006
2) آدمی لہولہو (غزلوں کا مجموعہ) 2011
3) نقد ونظر (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) 2012
4) احساس وادراک (رباعیوں کا دیوان) 2015
5) دھوپ اور صحرا (غزلوں کا مجموعہ) 2016
سخن شناسی (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) 2016
7) محاکمہ (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) 2019ت

ترتیب شدہ کتابیں: 1) رہنمائے اشتہار سازی ونامہ نگاری (صحافت) 2019
2) خزینۂ ادب (انتخابِ نظم ونثر برائے نصاب) 2019
* تقریباً سو مضامین ومقالات رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

انعامات واعزازات: * حفیظ میرٹھی ایوارڈ برائے شاعری (منجانب ادارہ ادبِ اسلامی ہند حلقہ مہاراشٹرا، انڈیا)
* کرناٹک اردو اکادمی بنگلور (حکومتِ کرناٹک) کی جانب سے شعری مجموعے ''دھوپ اور صحرا'' پر پچیس ہزار روپے کا انعام
* عالمی ایوانِ ادب متحدہ عرب امارت کی جانب سے خادمِ ریختہ ایوارڈ برائے سال 2021
* ایسوسی ایشن آف مسلم پروفیشنلس ممبئی کی جانب سے نیشنل ایوارڈ فار ایکسیلینس ان ایجوکیشن 2021
* سہ ماہی ''ادبی محاذ'' (کٹک، اڑیسہ) میں خصوصی گوشے کی اشاعت
* ماہنامہ ''تعلیمی سفر'' لاتور (مہاراشٹرا) میں خصوصی گوشے کی اشاعت

سمیناروں اور مشاعروں میں شرکت:
* تقریباً پچاس قومی سمیناروں میں مقالوں کی پیشکشی
* کئی ریاستی اور قومی مشاعروں میں کلام کی پیشکشی
* جاریہ تحقیقی کام: اردو رباعی کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ: 1960ء کے بعد

Mob:9028598414

احساس پر منحصر ہے۔ جہاں دیانت داری اور فرضِ منصبی کا احساس ختم ہوا تو سمجھ لیجیے کہ توازن بگڑ گیا۔ مشغلے اور شوق کو فرضِ منصبی پر کبھی حاوی نہیں ہونے دینا چاہیے۔ اگر ایسا ہوا تو سمجھ لیجیے کہ خیانت ہوگئی۔

میں پوری دیانت داری کے ساتھ یہ کہنے کے موقف میں ہوں کہ میں نے اپنے شوقِ شاعری کو اپنے فرضِ منصبی پر کبھی حاوی ہونے نہیں دیا۔ میں نے شاعری کے شوق کو اس کی اپنی حد میں رکھنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ میں نے اپنی شعر گوئی کو اپنے پیشے میں کبھی مخل ہونے نہیں دیا۔ اس پوری اکیس سالہ تدریسی زندگی میں کبھی کسی طالبِ علم کو مجھ سے یہ شکایت نہیں رہی کہ میں نے کبھی ان کی حق تلفی کی ہے یا میری طرف سے کسی کا تعلیمی نقصان ہوا ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے پوری دیانت داری کے ساتھ تدریسی حق ادا کرنے کی توفیق عطا کی۔ شاعری کے شوق اور علمی وادبی ذوق کے علاوہ مجھے کسی اور چیز کا ذوق وشوق نہیں۔ فرضِ منصبی کی ادائے گی اور گھریلو ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے بعد جو کچھ وقت ملتا ہے اسے شعر گوئی اور دیگر علمی وادبی کاموں کے لیے استعمال کرتا ہوں۔ اگر زندگی کے مختلف شعبوں کے حدود کا پاس ولحاظ رکھا جائے تو ان کے درمیان توازن برقرار رکھنا کچھ مشکل نہیں۔

سوال(۲): آپ کی پیدائش صوبۂ کرناٹک میں ہوئی تعلیمی مراحل بھی یہیں طے ہوئے۔۔۔اور آپ کا تقرر ریاستِ مہاراشٹرا کے ایک کالج میں بحیثیت اردو استاد ہوا۔۔۔آپ یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں کہ ان دونوں صوبوں کی اردو تہذیب وتمدن میں کیا فرق آپ نے محسوس کیا ؟۔۔۔ اپنے تجربات کے حوالے سے جواب دیں۔۔۔!

جواب: سب سے پہلے تو میں اس بات کی وضاحت کردوں کہ میری پیدائش کرناٹک میں ضرور ہوئی لیکن میرے تمام تعلیمی مراحل یہاں طے نہیں ہوئے۔ صرف دہم جماعت تک میری تعلیم کرناٹک میں ہوئی۔ اس کے بعد کی تمام تعلیم حیدرآباد میں ہوئی۔ میں نے ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد سے اردو فاضل کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے ملحقہ کالج آف لینگویجس سے بی۔ اے اور ایم۔اے کیا ۔پھر حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی سے ایم ۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کی تکمیل کی۔ بعد میں ماس کمیونیکیشن اور ٹرانسلیشن تیکنیک میں پی جی ڈپلوما بھی اس یونیورسٹی سے کیا۔۔۔۔

ہاں! مہاراشٹرا میں واقع ایک سینئیر کالج میں بہ حیثیتِ استاد میرا تقرر ہوا جہاں اکیس برسوں سے تدریسی خدمات انجام دے رہا ہوں۔ میں جس کالج میں برسرِ کار ہوں وہ لاتور ضلع کے تعلقے اودگیر میں ہے۔ یہ علاقہ کرناٹک سے متصل ہے۔ بیدر اور گلبرگہ یہاں سے قریب ہیں۔ بیدر تو بہت ہی قریب ہے۔ تلنگانہ کی سرحد بھی نزدیک ہی ہے ۔ یہاں کے لوگوں کا بیدر، گلبرگہ اور حیدرآباد جانا آنا زیادہ ہے۔ مجھے مہاراشٹرا کے علاقے مراٹھواڑہ کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے جس میں آٹھ اضلاع (اورنگ آباد، جالنہ ،بیڑ، عثمان آباد ،لاتور، ناندیڑ، پربھنی ، احساس پر منحصر ہے۔ جہاں دیانت داری اور فرضِ منصبی کا احساس ختم ہوا تو سمجھ لیجیے کہ توازن بگڑ گیا۔ مشغلے اور شوق کو فرضِ منصبی پر کبھی حاوی نہیں ہونے دینا چاہیے۔ اگر ایسا ہوا تو سمجھ لیجیے کہ خیانت ہوگئی۔

میں پوری دیانت داری کے ساتھ یہ کہنے کے موقف میں ہوں کہ میں نے اپنے شوقِ شاعری کو اپنے فرضِ منصبی پر کبھی حاوی ہونے نہیں دیا۔ میں نے شاعری کے شوق کو اس کی اپنی حد میں رکھنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ میں نے اپنی شعر گوئی کو اپنے پیشے میں کبھی مخل ہونے نہیں دیا۔ اس پوری اکیس سالہ تدریسی زندگی میں کبھی کسی طالبِ علم کو مجھ سے یہ شکایت نہیں رہی کہ میں نے کبھی ان کی حق تلفی کی ہے یا میری طرف سے کسی کا تعلیمی نقصان ہوا ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے پوری دیانت داری کے ساتھ تدریسی حق ادا کرنے کی توفیق عطا کی۔ شاعری کے شوق اور علمی وادبی ذوق کے علاوہ مجھے کسی اور چیز کا ذوق وشوق نہیں۔ فرضِ منصبی کی ادائے گی اور گھریلو ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے بعد جو کچھ وقت ملتا ہے اسے شعر گوئی اور دیگر علمی وادبی کاموں کے لیے استعمال کرتا ہوں۔ اگر زندگی کے مختلف شعبوں کے حدود کا پاس ولحاظ رکھا جائے تو ان کے درمیان توازن برقرار رکھنا کچھ مشکل نہیں۔

سوال(۲): آپ کی پیدائش صوبۂ کرناٹک میں ہوئی تعلیمی مراحل بھی یہیں طے ہوئے۔۔۔اور آپ کا تقرر ریاستِ مہاراشٹرا کے ایک کالج میں بحیثیت اردو استاد ہوا۔۔۔آپ یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں کہ ان دونوں صوبوں کی اردو تہذیب وتمدن میں کیا فرق آپ نے محسوس کیا ؟۔۔۔ اپنے تجربات کے حوالے سے جواب دیں۔۔۔!

ہنگولی) آتے ہیں۔ پولس ایکشن (ستمبر

۱۹۴۸ء) سے پہلے تک یہ علاقہ سلطنتِ آصفیہ حیدرآباد کا حصہ تھا۔ کرناٹک کا وہ علاقہ جو سلطنتِ آصفیہ کی عملداری میں تھا (جسے دو تین سال پہلے تک حیدرآباد کرناٹک کہا جاتا تھا لیکن آج اسے کلیان کرناٹک کہا جارہا ہے) اس پر اور مراٹھواڑہ کی اردو تہذیب وتمدن پر حیدرآبادی تہذیب وتمدن کا گہرا اثر ہے۔ اس اعتبار سے میں جس علاقے میں رہتا ہوں وہاں کی اردو تہذیب اور کلیان کرناٹک کی اردو تہذیب میں ایسا کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

ویسے بھی اردو تہذیب ایک بڑی اور ہمہ گیر تہذیب ہے اس لیے اس کے مظاہر ہر جگہ تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اب علاقائی اثرات تو کچھ نہ کچھ ہوتے ہی ہیں۔ یہاں کی بول چال کی اردو زبان پر مراٹھی لہجے کا اثر دکھائی دیتا ہے جو ایک فطری بات ہے۔ ایک ہی زبان ہونے کے باوجود ہر علاقے کے لہجے اور محاورے میں کچھ نہ کچھ فرق آتا ہی ہے۔ کیوں کہ ماہرِ لسانیات کے مطابق ہر پچاس میل کے فاصلے پر زبان کے لہجے اور محاورے میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ شہری علاقوں کی بہ نسبت دیہی علاقوں میں یہ اثر کچھ زیادہ نظر آتا ہے۔ ایسا ہونا بھی بالکل فطری ہے۔ ہر علاقے کی شہری زبان اور دیہی زبان میں فرق رہتا ہی ہے۔ اردو تعلیم اور زبان و ادب کی بات کریں تو میرا خیال ہے کہ اگرچہ کرناٹک میں بھی صورتِ حال اچھی ہے لیکن اس معاملے میں مہاراشٹرا کو بہرحال کرناٹک پر سبقت حاصل ہے۔ خاص طور پر مراٹھواڑہ کے علاقے میں اردو کا ماحول بہت اچھا ہے۔

سوال (۳): آج آپ استاد ہیں کبھی آپ طالبِ علم تھے۔۔۔؟ آج آپ کے زیرِ سایہ کئی طلبا وطالبات تعلیم حاصل کررہے ہیں۔۔۔ کیا آپ اپنے طالب علموں سے مطمئن اور پُرامید ہیں۔۔۔؟ جواب میں مجموعی صورتِ حال کا جائزہ نہ لیں صرف اپنے تجربات کے حوالے سے جواب دیں۔۔۔۔!

جواب: اگر آپ طلبا کے ادبی ذوق اور آگے چل کر اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت میں ان سے پُرامید ہونے کی بات کررہے ہیں تو آپ مجھے کہنے دیجیے کہ اس حوالے سے صورتِ حال کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ طلبا وطالبات کو مطالعے کا شوق ہی نہیں ہے۔ وہ پڑھنے سے اور کتاب سے ایسے بھاگتے ہیں جیسے سگ گزیدہ پانی سے بھاگتا ہے۔ جب کچھ پڑھنے ہی کا شوق نہیں تو ادب کا ذوق کیسے پیدا ہوگا؟ یہ چنگاری خال خال ہی نظر آتی ہے۔ انڈر گریجویٹ کی بات تو چھوڑیے پوسٹ گریجویشن کرنے والوں میں بھی اس چنگاری کا فقدان نظر آتا ہے۔ اور تو اور چند مستثنیات سے قطعِ نظر پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے والوں میں بھی جیسا ادبی ذوق ہونا چاہیے وہ ندارد ہے۔ نہ ان کی زبان درست نہ املا درست اور نہ اردو ادب کی تاریخ اور اصناف پر گفتگو کرنے کے اہل۔ چار سطریں ڈھنگ سے لکھنے نہیں آتا اور پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کی غرض سے جو طلبا مجھ سے رجوع ہوتے ہیں میں پہلے ان سے گفتگو کر کے ادب کی مختلف شعری ونثری اصناف پر ان کی معلومات کا جائزہ لیتا ہوں۔ پھر کچھ عنوانات دے کر ان سے مضامین لکھواتا ہوں۔ جب مجھے کسی حد تک اطمینان حاصل ہوتا ہے تو اسے اپنی نگرانی میں لے کر کام کرواتا ہوں۔ بصورتِ دیگر انھیں مطالعے میں اضافہ کرنے اور لکھنے کی مشق کرنے کا مشورہ دے کر واپس بھیج دیتا ہوں۔ جب کسی طالب علم میں مطالعے کا شوق اور ادبی ذوق دیکھتا ہوں تو اس کے ذوق کو پروان چڑھانے کی مقدور بھر کوشش بھی کرتا ہوں۔

سوال (۴): ما شاء اللہ۔۔۔! عصری شعری دنیا میں آپ بہ حیثیتِ شاعر معتبر اور جانے مانے جاتے ہیں۔۔۔ اپنی شاعری کے شوق، استاد یا اساتذہ کے بارے میں بتائیں اور صنفِ رباعی میں آپ کی انفرادیت کیا ہے کہ آپ کا نام اچھے رباعی گو شعرا میں آتا ہے۔۔۔؟

جواب: مجھے ہائی اسکول کے زمانے ہی سے شاعری سے لگاؤ رہا ہے۔ مجھے نثری اسباق کی بہ نسبت شعری اسباق پڑھنے میں زیادہ لطف آتا تھا۔ میں نے پہلی نظم ۱۹۸۱ء میں کہی تھی۔ اس وقت میری عمر سولہ برس کی تھی اور دہم جماعت کا متحان کامیاب کرچکا تھا۔ یہ نظم فیشن پرستی کی مذمت میں تھی۔ اب وہ نظم میرے پاس محفوظ نہیں۔

جہاں تک فنِ شاعری میں استاد کی بات ہے تو میں نے باضابطہ کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا۔ اساتذہ کے کلام اور عروض وبلاغت کی کتابوں کا مطالعہ ہی میرا رہنما اور استاد ہے۔ میں نے ۱۹۸۴ء ہی میں مروجہ اوزان وبحور سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کرلی تھی اور شعر کی تقطیع بھی کرلیا کرتا تھا۔ غالباً ۱۹۸۵ء میں ایک غزل گلبرگہ کے استاد شاعر حضرت سرورؔ مرزائی کو دکھائی تھی۔ اس غزل کے ایک مصرعے میں میں نے لفظ ''سعی'' کی ع کو متحرک باندھا تھا۔ یعنی ''مفا'' کے وزن پر، جب کہ یہ ''فاعِ

''کے وزن پر ہے۔سرورؔ مرزائی صاحب نے اس لفظ کو اس کے درست تلفظ کے ساتھ نظم کر کے مصرعے کی اصلاح کر دی تھی۔بعد میں ان سے رجوع ہونے کا موقع نہیں ملا۔

۱۹۸۶ء میں میری ملاقات استاد الشعرا حضرت رشید احمد رشید کے شاگرد اور جانشین صابر رشیدی مرحوم سے ہوئی۔ایک نعت اور دو تین غزلوں پر ان سے بھی اصلاح لی ہے۔اگر چہ میں نے ان سے دو چار تخلیقات ہی پر اصلاح لی ہے لیکن مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ان کی صحبت اور رفاقت سے میرے ادبی اور تنقیدی شعور میں نکھار آیا۔صابر صاحب ۱۹۹۰ء کے آس پاس بنگلور منتقل ہو گئے۔اس کے بعد میں نے نہ کسی سے اصلاح لی اور نہ کسی سے مشورۂ سخن کیا۔

زبان وادب کی تعلیم ہو یا نظم ونثر میں لکھنے کی بات ہو ان میں سے کسی معاملے میں بھی مجھے کسی استاد سے فیض حاصل کرنے کا بوجوہ کوئی خاص موقع نہیں ملا۔ایم۔فل کرنے کے دوران میں پروفیسر رحمت یوسف زئی، پروفیسر محمد انورالدین اور پروفیسر سلیمان اطہر جاوید سے تحقیق وتنقید کے رموز ونکات اور اصول سیکھنے کا کچھ موقع ملا۔پروفیسر رحمت یوسف زئی (جو میرے ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کے نگران رہے ہیں) سے کسبِ فیض کا موقع کچھ زیادہ ملا۔اس ضمن میں میں کہہ سکتا ہوں کہ I am fully self made man۔

جہاں تک صنفِ رباعی میں میری انفرادیت کی بات ہے تو میں خود اس بارے میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔یہ تو میرے ناقدین کا کام ہے۔میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ رباعی کے اوزان،اس کے فنی تقاضوں اور موضوعات کا پاس ولحاظ رکھنے کی میں نے کوشش کی ہے۔اب اس میں مجھے کہاں تک کامیابی ملی ہے یہ ناقدین بتائیں گے۔بقول نظامی عروضی سمرقندی:

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم وبیش را

ویسے فنِ رباعی کے ماہرین اور شعر وسخن کی کئی معتبر ہستیوں نے میری رباعیات کی تحسین وستائش کی ہے۔

سوال(۵): شاعری کرنے کے لیے کیا علمِ عروض کا جاننا ضروری ہے؟ ضروری ہے تو کیوں اور ضروری نہیں تو کیوں؟

جواب: علمِ عروض وہ علم ہے جس سے شعر کا وزن یا اس کا موزوں اور ناموزوں ہونا معلوم ہوتا ہے۔یعنی اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شعر وزن میں ہے یا بے وزن ہے۔واضح ہو کہ ہمارے علمائے عروض و بلاغت نے شعر کے لیے وزن کو ضروری قرار دیا ہے علمِ عروض ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عبارت نظم ہے یا نثر۔اسی علم سے صحیح بحر اور درست وزن کی شناخت ہوتی ہے۔اگر بحور واوزان کا اچھا ادراک نہ ہو اور کوئی صرف طبیعت کی موزونی کی بنیاد پر شعر کہتا ہو تو کبھی کبھی یہ طبیعت کی موزونی اس کو بھٹکا بھی دیتی ہے۔کیوں کہ کچھ اوزان ایسے بھی ہیں جن کا آہنگ ملتا جلتا ہے۔طبیعت کی موزونی پر انحصار کرنے والے شعرا کبھی کبھی ایک وزن میں کہتے کہتے دوسرے وزن میں چلے جاتے ہیں اور انھیں معلوم بھی نہیں ہوتا۔عروض سے ناواقفیت کی بنا پر کبھی کبھی وہ موزوں شعر کو ناموزوں اور ناموزوں شعر کو موزوں بتاتے ہیں۔وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ شعر کس وزن میں ہے اور اس کی کیا باریکیاں ہیں۔تقطیع کرنے کے اصول سے بھی وہ نابلد ہوتے ہیں۔ہر شاعر کو عروض اس حد تک تو جاننا چاہیے کہ اس سے اس کے کلام میں کوئی عروضی سقم پیدا نہ ہو سکے۔اور کسی محفل میں شرمندہ ہونے کی نوبت نہ آسکے۔اس موضوع پر میری کہی ہوئی ایک رباعی یاد آرہی ہے جس کا یہاں نقل کرنا بے محل نہ ہوگا۔ملاحظہ فرمائیں:

شرمندہ ہونے سے بچاتا ہے عروض
توقیر بھی شاعر کی بڑھاتا ہے عروض
اک درجہ بڑا دوسروں سے ہوتا ہے
شاعر وہ، جسے کامل آتا ہے عروض

بہر حال عروض کے بہت سارے فائدے ہیں اسے بحدِ امکان سیکھنا چاہیے۔اس لیے میری نظر میں ہر شاعر کے لیے علمِ عروض کا جاننا ضروری ہے۔اس سے فائدے ہی ہیں نقصان کچھ نہیں ۔۔۔یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ عروضی ہونا ایک لگ چیز ہے اور شاعر ہونا چیزے دیگر است۔ہر عروضی اچھا شاعر نہیں ہوسکتا۔۔۔اور ضروری نہیں کہ ہر اچھا شاعر اچھا عروضی بھی ہو۔کئی ماہرینِ عروض گزرے ہیں جو شعر بھی کہتے تھے مگر آج شاعر کی حیثیت سے وہ گمنام ہیں۔اس کے برخلاف ایسے کئی شعرا آج بھی زندہ ہیں اور ان کا کلام آج بھی دلوں کو تڑپاتا ہے جو عروض سے واجبی سی واقفیت رکھتے تھے۔۔۔کہنے کا مقصود یہ ہے کہ صرف طبیعت کی موزونی پر انحصار کرنا کبھی کبھی شاعر کو گمراہ کر دیتا ہے اس لیے علمِ عروض سے اچھی واقفیت ہو تو اس کے لیے بہتر بلکہ احسن ہے۔کیوں کہ یہ واقفیت شاعر کو ناموزوں

شعر کہنے سے بچاتی ہے ۔۔۔ دیکھیے !علمائے عروض وبلاغت کے مطابق شعر کے دوعیب سب سے بڑے ہیں۔ایک اس کا بے وزن یا ناموزوں ہونا اور دوسرا اس کا مہمل ہونا۔علمِ عروض سے اچھی واقفیت رکھنے والا شاعر ناموزون اور بے وزن شعر کہنے سے بچا رہتا ہے۔آج کل اخبارات ورسائل اور سوشیل میڈیا میں ناموزوں، بے بحر اور ساقط الوزن اشعار جو شائع ہو رہے ہیں یہ سب علمِ عروض کے نہ جاننے کا نتیجہ ہے۔

سوال(۶): شاعری کے لے علاوہ آپ ادبی مضامین بھی لکھتے ہیں۔۔۔تبصرے بھی کرتے ہیں۔۔سیمیناروں کے لیے مقالے بھی قلمبند کرتے ہیں۔۔۔نقد وتحقیق میں آپ کے پی ۔ایچ۔ڈی کا مقالہ مضطر مجاز مرحوم کی حیات اور فن پر تھا۔۔۔اس تصنیف کی اشاعت کے بعد بہ حیثیت محقق و نقاد آپ کو تسلیم بھی کیا گیا۔۔۔لیکن۔۔۔اس کے بعد کوئی ایسا معیاری اور قابل، قدر ادبی کارنامہ آپ کی طرف سے سامنے نہیں آیا۔۔۔کیوں؟

جواب: ایسا نہیں ہے کہ اس تصنیف کے بعد میری اور کوئی تصنیف منظرِ عام پر نہیں آئی۔ اس کتاب کے بعد میرے تنقیدی مضامین کے تین مجموعے (نقد ونظر،سخن شناسی،محاکمہ) شائع ہوئے جن میں ستر مضامین ہیں۔ان کتابوں کی پذیرائی بھی ہوئی ۔کئی معتبر ناقدین نے ان پر حوصلہ افزا تبصرے بھی لکھے ۔اس کے علاوہ کئی مقالات ومضامین رسائل میں متواتر شائع ہوتے آرہے ہیں۔پچیس تیس مضامین اور ہیں جو کتابی صورت میں شائع ہونے کی راہ دیکھ رہے ہیں۔۔ایک معیاری مقالہ لکھنا بھی کبھی کبھی ایک کتاب لکھنے کے مساوی ہوتا ہے۔مثلاً ایک عروضی مسئلے ''تسبیغ وازالہ'' پر سات آٹھ صفحے کا میرا مقالہ ہے جو ایوانِ اردو دہلی میں شائع ہوا ہے۔ اسے لکھنے میں مجھے تقریباً ایک ڈیڑھ سال کا عرصہ لگا۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک مختصر مگر مدلل، معیاری اور مستند مقالہ یا مضمون لکھنے کے لیے بھی بہت وقت لگتا ہے۔دلائل اور مستند حوالے تلاش کرنا دقّت طلب ہی نہیں وقت طلب کام ہے۔۔۔۔اس دوران میں میری دو غزلوں کے مجموعوں کے علاوہ رباعیات کا ایک دیوان بھی شائع ہوا۔۔۔

جہاں تک ایک موضوع پر کسی کتاب کی عدم اشاعت کی بات ہے تو عرض ہے کہ'' مراٹھواڑہ میں اردو نظم :۱۹۶۰ء کے بعد'' کے زیرِ عنوان ایک طویل تحقیقی وتنقیدی مقالہ ۲۰۰۸ء کے آس پاس قلمبند کر چکا ہوں لیکن اس کے کچھ حصے بار بار مکان کی تبدیلی کی وجہ سے گم ہو گئے ہیں یا کئی فائلوں اور کاغذات میں بکھرے ہوئے ہیں جو مل نہیں رہے ہیں ،اس لیے وہ کتاب ابھی تک شائع نہ ہوسکی۔ پچھلے سات آٹھ برسوں سے'' اردو رباعی ۱۹۶۰ء کے بعد'' کے عنوان سے ایک تحقیقی کام شروع کیا ہے جس کے تقریباً تین سو صفحات ٹائپ ہو چکے ہیں۔ابھی لگ بھگ دو سو صفحات کا مواد لکھنا ہے۔یہ کام جاری ہے۔میرے منصوبے کے اعتبار سے اس کتاب کو بھی دو تین سال قبل ہی منظرِ عام پر آجانا چاہیے تھا لیکن کام کی وسعت، ملازمت کی مصروفیات اور کچھ خانگی مسائل کی وجہ سے یہ منصوبہ اب تک پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ان شاء اللہ چند دن بعد اس کی تکمیل کی طرف توجہ دوں گا۔اس کے بعد'' مراٹھواڑہ میں اردو نظم: ۱۹۶۰ء کے بعد'' کی اشاعت بھی عمل میں آئے گی ان شاءاللہ۔

سوال(۷): درس وتدریس اور قلم کاری کے علاوہ آپ نے زبان وادب کے فروغ کے لیے محدود پیمانے پر ہی سہی کیا کیا۔۔؟ کیا کر رہے ہیں؟اور کیا کرنے کا ارادہ ہے؟

جواب: یہ بڑا تفصیل طلب سوال ہے۔مختصراً عرض ہے کہ درس وتدریس کا پیشہ اختیار کیے ہوئے مجھے اکیس برس ہوئے۔لیکن میں اس سے بہت پہلے ہی سے تعلیم وتعلُّم اور زبان وادب کے استحکام اور فروغ کے سلسلے میں بساط بھر کوشش کرتا رہا ہوں۔۱۹۸۷ء میں نے اپنے وطن چٹگوپہ (ضلع بیدر کرناٹک) میں ''انجمن نوجوان خدمت گارانِ علم وادب'' کی شاخ قائم کی تھی جس کے بانی وصدر مرحوم صابر رشیدی تھے۔اس کا صدر دفتر بیدر میں تھا۔اس انجمن کے تحت ہر مہینہ ایک ادبی اجلاس اور شعری نشست کا انعقاد عمل میں آتا تھا۔جونیئر کالج اور ڈگری کالج میں زیرِ تعلیم طلبا کو ان کی صلاحیت کے اعتبار سے عنوانات دے کر ان سے مضامین لکھواتا اور انجمن کے ماہانہ اجلاس میں پیش کرواتا۔کسی میں تحریری صلاحیت نہ ہوتی تو ان سے تقریر کرواتا۔کسی کا رجحان شعر گوئی کی طرف دیکھتا تو اسے شعر کہنے پر اکساتا۔انجمن کے زیرِ اہتمام ہر سال ربیع الاول کے مہینے میں میلاد النبی کے موقعے پر ہائی اسکول، جونیر کالج اور ڈگری کالج کی سطح پر تحریری وتقریری مقابلے منعقد کر کے کتابوں کی شکل میں انھیں انعام دیتا تھا۔اس سے مقصود یہ تھا کہ طلبا میں علم وادب کا ذوق پروان چڑھے اور ان میں تحریری وتقریری

صلاحیت پیدا ہو سکے۔ الحمدللہ اس کے اچھے نتائج بھی برآمد ہوئے۔ میرے پیشۂ تدریس سے وابستہ ہونے سے برسوں قبل (جب کہ میں تجارت سے وابستہ تھا) جونیر کالج، ڈگری کالج اور ایم۔اے میں زیرِ تعلیم طلبا اردو زبان اودب کی تعلیم کے سلسلے میں مجھ سے رجوع ہو کر رہنمائی حاصل کرتے تھے اور میں رضا کارانہ طور پر بساط بھر ان کی رہنمائی کیا کرتا تھا۔

اپنے وطن چنگلو پہ میں سالانہ مشاعرے کے علاوہ گاہے گاہے شعری نشستیں بھی منعقد کرتا تھا۔ بسواکلیان میں علامہ عطا کلیانوی کے عرس کے موقعے پر بھی سالانہ نعتیہ مشاعرے اور کبھی کبھی مذاکرے کے انعقاد میں سرگرم رہتا تھا۔ میں نے اپنے وطن کے کچھ غیر مسلم دوستوں کو اردو زبان بھی سکھائی ہے۔ جی۔سی۔ سانگا نامی ایک غیر مسلم دوست کو تو میں نے اپنی انجمن کا جوائنٹ سیکریٹری بنایا تھا۔ وہ اردو اور عربی اچھی طرح پڑھتا تھا۔ اردو تو وہ لکھ بھی سکتا تھا۔ مئی ۱۹۸۸ء میں اردو بچاؤ تحریک حیدرآباد کی جانب سے ریاست آندھرا پردیش میں اردو کو اس کا جائز حق دینے کے مطالبے کو لے کر حیدآباد میں کئی جگہ بھوک ہڑتال شروع کی گئی تھی۔ اس کے مرکزی کیمپ واقع بیچلرز کوارٹرس معظم جاہی مارکیٹ میں میں نے بھی بھوک ہڑتال میں شرکت کرتے ہوئے نہ صرف ضلع بیدر کی بلکہ پورے کرناٹک کی نمائندگی کی تھی۔

میرے کالج کے بعض غیر مسلم اردو کے شائقین کو رضا کارانہ طور پر اردو زبان سکھانے کی کوششیں بھی کی ہیں۔ اب وہ کچھ کچھ پڑھ کی سکتے ہیں۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ شرمشٹھا بھونسلے نام کی ایک لڑکی بی اے میں زیرِ تعلیم تھی۔ اسے اردو شعر وسخن سے بہت دلچسپی تھی۔ میر وغالب کے کئی شعر اسے ازبر تھے۔ جب وہ مجھ سے اردو سیکھنے کی غرض سے رجوع ہوئی تو اسے بھی بڑی حد تک اردو کی مبادیات سکھادیں۔ بہت ذہین تھی شاید بعد میں اس نے مشق کر کے اور بھی مہارت پیدا کرلی ہوگی۔۔۔ لوگوں سے سنتا تھا کہ اودگیر میں کسی زمانے میں ادبی سرگرمیاں ہوا کرتی تھیں لیکن میرے وہاں جانے کے بعد تو ایسی سرگرمیوں کا دور دور تک نام ونشان نہ تھا۔ یہاں میں نے موقع بہ موقع ادبی محفلوں کے انعقاد کی طرف توجہ کی۔ نتیجے کے طور پر مقامی سطح پر ادارۂ ادبِ اسلامی کا قیام عمل میں آیا جس کا میں صدر ہوں۔ اس ادارے کے زیرِ اہتمام اقبال لیکچر سیریز شروع کی جس کے تحت ہر مہینہ اقبال کے کلام اور ان کے فکر وفلسفہ پر لیکچر ہوتے۔ اس سیریز کے تحت خود میں نے کئی لیکچر دیے۔ پچھلے دو برسوں سے کوویڈ کی وجہ سے یہ سرگرمیاں معطل ہیں۔

ایک عرصۂ دراز تک اصلاحِ سخن کی خدمت بھی انجام دی ہے۔ اگرچہ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے لیکن بوجوہ پچھلے آٹھ دس برسوں سے اس خدمت سے بچنے لگا ہوں۔ بعض نثر نگار حضرات بھی اصلاح کی غرض سے اپنی نگارشات مجھے دکھاتے ہیں۔ دور ونزدیک کے کئی شعرا عروضی اور فنی مسائل کی تفہیم وتشریح کے سلسلے میں بذریعے واٹس ایپ رجوع ہوتے ہیں۔ اپنی قدرت وبساط کے مطابق ان رہنمائی کرتا ہوں۔ طلبا وطالبات کی ذہنی صلاحیتوں اور ان کے رجحانات کو دیکھتے ہوئے کسی کو شعر کہنے کی تو کسی کو نثر نگاری کی ترغیب دے کر ان کی اصلاح وتربیت کی خدمت انجام دیتا ہوں۔ یہ تمام سرگرمیاں بھی تو زبان وادب کے فروغ واشاعت ہی کا ذریعہ ہیں۔ جہاں تک آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے تو اس سلسلے میں یہی کہوں گا کہ اللہ کی مرضی رہی تو یہی سرگرمیاں آئندہ بھی جاری رہیں گی۔ ارادے اور ارمان تو بہت ہیں مگر مہلتِ زندگی۔۔۔؟ میں نے تقریباً پچیس برس سال قبل ایک غزل کہی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے:

ارادے بہت اور ارماں بہت ہیں
مگر مہلتِ زندگی مختصر ہے

مگر اس کے باوجود میں جو وقت ملے اس کو غنیمت سمجھنے کا قائل ہوں اور اسی کی تلقین بھی کرتا ہوں۔ اس موضوع پر میری دو رباعیاں ملاحظہ فرمائیں:

تدبیر ومشقت کو عبادت سمجھو
اس مہلتِ ہستی کو رحمت سمجھو
بے کار گنواؤ نہ کوئی لمحہ بھی
جو وقت ملے اس کو غنیمت سمجھو

جو تم سے ہو سکے وہ تحصیل کرو
ہے وقت کھڑا سر پر، تعجیل کرو
دیکھو! نہ نکل جائے کہیں ہاتھ سے وقت
اٹھو! منصوبوں کی تکمیل کرو

☆☆☆

افسانہ

دیانتداری...

فرحانہ نازنین

(شہادت مارکیٹ کچہری روڈ، بیگوسرائے 851101 بہار، موبائل نمبر 9470705183)

گورے اور ساریکا کی پرورش ایک ساتھ ہی ہوئی تھی۔ ساریکا پروفیسر دیال سنگھ کی بیٹی تھی اور گورے اس کی بوا کا بیٹا تھا۔ گورے کا پورا نام تو گوروچن سنگھ تھا۔۔ مگر اپنے سرخ سفید رنگت کی وجہ سے بچپن سے ہی گورے کے نام سے مشہور تھا۔ گورے... یہی اس کی پہچان تھی۔۔ گورے کا چہرہ جتنا گورا تھا، اسکا دل اتنا ہی کالا تھا.... ترقی کے راستے پر پاؤں رکھتے ہی اس نے اپنے سر سے فرض اور ایمانداری کی پگڑی اتار پھینکی۔۔ اس کا کہنا تھا کہ۔۔ انسان کو اس زندگی میں کامیاب ہونے کے لئے۔۔ جھوٹ،، چھل، خوشامد کا چولا پہننا پڑتا ہے۔۔ جو ایسا نہیں کرتے، وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔۔ ساریکا کو ہمیشہ حیرت ہوتی۔۔ باپو کے ساتھ میں پل کر بھی گورے اتنا خودغرض اور لالچی کیسے ہو گیا۔۔ گورے اور ساریکا میں اکثر بحث چھڑ جایا کرتی... ساریکا کا کہنا تھا کہ۔۔۔ "اگر انسان کے پاس ایمانداری اور فرض شناسی نہیں ہے تو انسان ایک خالی عمارت ہے ڈھلتی دیوار ہے۔۔"

گورے شدومد سے اس کی تردید کرتا... "انسان کو یہ ایمانداری اور فرض شناسی دیتی کیا ہے۔ چند جھوٹی تسلیاں اور بہلاوے۔۔" اس بحث میں کوئی کسی کو مطمئن نہیں کر پاتا۔۔ انجام کار دونوں ہی بحث ادھوری چھوڑ کر اپنی اپنی پڑھائی میں مشغول ہو جاتے۔ ساریکا پی جی کی طالبہ تھی۔۔ اور بچپن سے لیکر اب تک ٹاپ لسٹ پر رہی تھی۔ گورا بھی کچھ کم ذہین نہ تھا یہ اس کی ذہانت ہی تھی کہ وہ یو۔ پی۔ ایس۔ سی کمپلیٹ کر کے ڈی ایس پی کی ذمہ دار پوسٹ پر تعینات تھا۔۔ اگر اس میں کچھ نہیں تھا تو وہ تھی ایمانداری اور دیانت داری... اس کے باوجود بھی پروفیسر دیال سنگھ کا کل تو اسی سے چلنا تھا کیونکہ کہ ساریکا تو لڑکی تھی نا۔۔ پروفیسر دیال سنگھ نے اس کی پرورش بھی اسی لئے ہی کی تھی کہ اس سے انکا کل چلے گا۔۔ ان کی پتنی اکثر ہی اپنی اس کمی کا ذکر کیا کرتیں تو دیال سنگھ ہنس کر کہا کرتے...." کاہے چنتا کرتی ہو، اپنا گورے ہے نا۔۔ ونس نا سہی کل تو اس سے چل ہی جائے گا۔۔" اور وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو جاتیں، کرتیں بھی کیا، واہے گرو سے تو بہت منتیں مرادیں مانگی۔۔ مگر ایک بیٹی کے بعد دوبارہ گود بھری ہی نہیں۔

آج صبح ہی صبح گورے اپنے فل یونیفارم اور بیچ کے ساتھ پروفیسر دیال سنگھ کے روبرو کھڑا تھا۔ ساریکا بھی یونیورسٹی کے لئے نکل رہی تھی۔ وہ بھی ٹھٹھک گئی۔ پورے یونیفارم میں گورے غجب کا بانکا جوان دکھ رہا تھا۔ ایسا کہ نظر بھر دیکھنا دشوار تھا۔ ساریکا نظروں ہی نظروں سے اپنے گبھرو جوان

بھائی کی آرتی اتارتی پروفیسر دیال سنگھ کے سامنے بیٹھ گئی۔خوبصورت ٹی پاٹ سے گرما گرم بھاپ اڑاتی خوشبودار چائے نکال کر پہلے اپنے باپو کو دی پھر گورے کو، آخر میں اسنے خود کے لئے نکالا اور ٹھہر ٹھہر کر پینے لگی۔گورا پروفیسر دیال سنگھ کے سامنے بیٹھا تھا کسی سوچ میں گم، جسے کوئی اہم بات کرنی ہو۔تبھی دیال سنگھ نے پوچھ لیا۔

ہاں پتر! کہو کیا کہنا چاہ رہے ہو۔۔

باپو آپ کی یہی بات بہت اچھی لگتی ہے کہ آپ کہنے سے پہلے ہی جان لیتے ہو کہ ہمیں کچھ کہنا ضرور ہے۔

سو تو ہے پتر! ہم واہے گرو کے پرتیک جو ٹھہرے۔۔اب سنکوچ تیاگو اور کہہ دو جو کہنا ہے۔بات کیا ہے۔۔۔

منسٹر ودیا چند جی نے مجھے ڈی ایم کی پوسٹ آفر کی ہے۔

قیمت کیا مانگی ہے۔۔

کچھ بھی نہیں باپو۔۔اس بار جو ایتھلی جینس کے ٹیسٹ ہوئے ہیں۔اس کی کاپی آپ کے پاس چیک ہونے آئی ہے۔اس کا بیٹا راجیشوری بھی اس میں شامل ہے۔میں آپ کو اس کا رول نمبر اور آئی ڈی دے دیتا ہوں۔ بس اسے ٹاپر لسٹ میں رکھنا ہے۔

پروفیسر دیال سنگھ زیرِ لب بدبدایا۔۔

"بھرشٹ نیتا۔۔۔"

او کے پتر۔دیکھوں گا۔اگر وہ اس قابل ہوا تو ضرور ٹاپ پر رہے گا۔

قابل کی بات نہیں ہے باپو۔شیور کی بات ہے۔ادھر وہ ٹاپ اور ادھر میرا پروموشن۔۔

پتر!! بھروسہ رکھ! اس پتھ پر پاؤں پسارے بنا بھی تم ڈی-ایم ضرور بنو گے کیونکہ تم پروفیسر دیال سنگھ کے سپتر ہو۔۔

باپو۔ہاں پتر!!

پروفیسر دیال سنگھ نے اپنے اصولوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔اگر وہ میرٹ میں ہوگا۔۔پھر میں بھی تھوڑا پروموشن کر دوں گا۔۔بس آخری بات۔۔۔

گورے چپ چاپ اٹھ کر چل دیا وہ جانتا تھا باپو اپنے اصول کے پکے ہیں۔۔۔اور چند ہی دنوں میں ریزلٹ آ گیا۔جس میں ایک دلت لڑکا ٹاپر تھا۔مگر راجیشوری کا نام کہیں بھی نہیں تھا۔ٹھیک اسی دن یونیورسٹی سے واپسی میں پروفیسر دیال سنگھ کی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں موت واقع ہوگئی۔۔۔اسپاٹ ڈیتھ۔

ابھی گردوارہ میں پروفیسر دیال سنگھ کی چتا رکھی ہے سبھی لوگ۔۔ڈی-ایس-پی گوروچن سنگھ عرف گورے کا انتظار کر رہے ہیں کیونکہ ریتی رواج کے مطابق "کل" ہی تو اتم سنسکار کر سکتا ہے۔۔شام ڈھل چکی ہے اور دھیرے دھیرے رات بھی اپنے پاؤں پسار رہی ہے۔ مگر گورے اب تک نہیں آیا ہے۔۔شاید گورے کو آنا ہی نہیں ہے۔ہاں شاید اس کو نہ آنا تھا۔۔۔نا آیا وہ۔

سارا یکا غم سے نڈھال ہے رو رو کر آنکھیں سوج گئی ہیں، ماں کو سنبھالتے سنبھالتے بازو شل ہو رہے ہیں مگر سب سے بڑا دکھ اسے گورے کے نہ آنے کا ہوا ہے۔۔۔

اس کے ذہن میں جیسے کوئی درکھلا ہو، کوئی ان کہی بات پھیلی ہو۔۔جیسے وہ گورے کے نا آنے کی وجہ جان گئی ہو۔۔

وہ اچانک اٹھی۔۔بہتے آنسوؤں کو ہتھیلی کی پشت سے پونچھا۔۔کوئی سنکلپ لیا۔۔سامنے پڑی پگڑی اٹھا کر اپنے سر پر لپیٹنا شروع کر دیا۔۔۔ساتھ ہی ساتھ کہتی جاتی ہے۔۔۔

مینوں باپو دا پتر ا۔۔مینوں باپو دا پتر ا۔۔۔

مینوں اسا نوا تم سنسکار اتے کر دا وچ۔۔۔

(میں باپو کا بیٹا ہوں۔۔باپو کا اتم سنسکار میں کروں گی)۔

☆☆

افسانہ

بنجر

سدرہ علی احمد
(مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس)

ساون کا مہینہ تھا، برسات کی رِم جھم پھواریں لاکھوں کی مسافت طے کرنے کے بعد اڑتی ہوئی دھول کو خاموش کر رہی تھیں، درختوں میں نئی کونپلیں اپنی پیدائش کی خوشی مناتے ہوئے ہوا کے نرم جھونکوں میں رقص کر رہی تھیں، آم کے پیڑ میں بور آ چکے تھے اور کوئل کی کُو کُو بھی سنائی دے رہی تھی، دور ایک نیم کے پیڑ پر پڑے ہوئے جھولے سے کچھ پھول جیسے بچے اپنی لے میں گا رہے تھے اور جھولے کا مزا لے رہے تھے۔ ارے شابو تھوڑا دھیرے۔۔۔۔ کتنی بار بتا چکی ہوں مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں بھی تو تجھ سے کہتا ہوں رنو! ڈرا مت کر، بہادر لوگ ڈرتے نہیں ہیں۔ ارے تو، مجھے کہاں لڑائی لڑنے جانا ہے جو بہادر بنوں!

اسی اثناء میں ایک آدمی سامنے سے ہانپتا کانپتا تیزی سے دوڑا آتا ہے اور رنوں کا ہاتھ پکڑ کر الٹے پاؤں گھر کی طرف لے جاتا ہے۔ کیا ہوا چاچا، اچھا بھلا کھیل رہی تھی، کبھی تو کھیلنے دیا کرو۔۔۔۔۔ رنّو ابھی اپنی بات پوری بھی نہ کر پائی تھی کہ اس کی نظریں ایک ایسے منظر سے جا ٹکرائیں جس نے اس کے سارے رنگیلے کھیل، سونی گڑیا، ڈولتا جھولا، پھدکتا بچپن سب کو ایک ہی وقت میں خاک میں ملا دیا۔ گھر کے سامنے چارپائی پر اس کے دونوں ماں باپ ایسے سو رہے تھے کہ سارا اجگت بھی زور لگاتا تو اٹھا نہ پاتا۔ قریب سے کسی نے آہستہ سے سرگوشی کی کہ بہت بھلے تھے دونوں، بس کھیت جاتے ہوئے کھائی میں ایسے گرے کہ دوبارہ سانس ہی نہ آئی۔ سب لوگ رنّو کو باری باری تسلی دے رہے تھے اور اس کی بھولی صورت پر ترس کھا رہے تھے۔ ۹ سالہ بچی کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ اس کے لیے تو ماں باپ کا پیار ہی ساری دنیا تھی۔ سارا دن پڑوس میں کام کرنے کے بعد شام کو جب اماں اسے اپنے ہاتھوں سے روٹی کھلاتی تو وہ اس کے آنچل تلے تمام جہان کا چین محسوس کرتی اور ابا کی ایک آہٹ پر پانی کا گلاس لئے سرپٹ دوڑتی جو کاندھے سے ہل اتار کر بیلوں کو کھونٹے سے باندھ رہا ہوتا۔ رنو کے ہاتھ سے گلاس لے کر اسے خوب پیار کرتا۔ بس ایسی ہی سادی زندگی میں وہ پوری کائنات کا سکھ محسوس کر رہی تھی اس کے دونوں ماں باپ اس کے لئے تمام دنیا تھے۔ اپنے سامنے سے باری باری اپنے اماں ابا کو لوگوں کے کاندھے پر سوار ہوتا دیکھ کر رنّو بلبلا اٹھی، اس کی بڑی بڑی چمکیلی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو اس کے گال پر ٹپکنے لگے۔ چاچا ہمارے اماں ابا کو کہاں لیکر جا رہے ہو۔ انہیں اٹھاؤ نا، اٹھ جائیں گے یہ۔ کیا ہوا ہے کیوں نہیں بولتے کچھ! اس کو ایسے بلکتا دیکھ کر پاس کھڑی عورتوں نے اس کو زبردستی پکڑا اور وہ برابر اپنی توتلی زبان سے اپنے ماں باپ کو روکنے کے لئے کہہ رہی تھی۔۔۔۔ چاچی! تم تو مجھے پیار کرتی ہو نا، تم کیوں نہیں روکتی اماں کو۔۔۔۔۔ وہ مجھ سے ناراض ہیں۔۔۔۔ گڑیا مانگ رہی تھی نا میں ان سے! کہہ دو کہ رک جائیں ایسے چھوڑ کر نہ جائیں۔ میں اب کبھی بھی نہ مانگوں گی، باہر کھیلنے بھی نہ جاؤنگی۔۔۔۔۔ چاچی۔۔۔ پھپھو۔۔۔۔ وہ یوں ہی مچل مچل کر رو رہی تھی کہ اس کے ماں باپ اس کی نظر سے بہت دور چلے گئے تھے۔ شام کا اندھیرا چھا چکا تھا، سارے پرندے اپنے گھونسلوں میں پناہ لے چکے تھے، رنّو چار کچی دیواروں کے اندر چارپائی پر بیٹھی دروازے سے بیلوں کے پاس رکھے ہوئے ہل کو دیکھ رہی تھی اور اپنے ابا کا مسکراتا چہرہ سوچ کر ابا ابا چلاتے ہوئے ہل سے جا لپٹی اور اس کی آنکھیں دوبارہ پانی کی طرح بہنا شروع ہو گئیں۔ ابھی وہ ٹھیک سے رو بھی نہ پائی تھی کہ ایک مضبوط ہاتھ نے

اس کے بازو کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔۔۔۔ چھوڑو مجھے۔۔۔۔۔ کہاں لیکر جا رہے ہو۔ ۔۔ ۔۔۔درد ہو رہا ہے میرے ہاتھ میں۔۔۔۔ وہ التجائی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی کہ سرخ آنکھیں اس کے چہرے پر پڑیں اور کہا۔۔۔۔ائے چھوری! زیادہ اکڑ مت دکھا، ورنہ تیرے اماں ابا کی طرح تجھے بھی اس گڑھے میں گاڑ دوں گا۔ رنّو کسمساتی ہوئی ایک بڑے سے دروازے میں گھس گئی اس کی پھیلی ہوئی آنکھیں ایک ایک کر کے اندر کی ساری چیزوں کا نظارہ کر رہی تھیں۔ سامنے ایک لمبا چوڑا آدمی پٹھانی شلوار قمیص میں ملبوس، کاندھے تک بال، مروڑی ہوئی مونچھیں اور سرخ نکلی ہوئی آنکھوں سے رنو کو سرتاپا دیکھ رہا تھا، پاس میں اس کی بیوی جسے کریمن بیگم کے نام سے جانا جاتا تھا کھڑی تھی اسے دیکھ کر بولی۔ ائے چھوری! ایسے کیا دیکھ رہی ہے، لڈن چودھری ہیں یہ، کبھی دیکھا نہیں ہے کیا؟۔۔۔۔ پھر ایک ترچھی نظر چودھری پر ڈالی اور بولی۔۔۔۔۔ اے ہاں، تو نے کہاں دیکھا ہوگا، چھٹانک بھر کی جو ہے۔۔۔۔۔اچھا سن ادھر آ (رنّو اپنے چھوٹے چھوٹے قدم اس کی طرف بڑھاتی ہے) کریمن اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر طنزاً مسکراتے ہوئے کہتی ہے۔۔۔۔۔ دیکھ تیرے اماں ابا تو اوپر چلے گئے، تجھے لیکر بھی نہیں گئے اور اتنے بڑے گاؤں میں تیرا کوئی ہے بھی تو نہیں۔ اب اکیلے اس کچی کوٹھری میں تجھے چھوڑ بھی تو نہیں سکتے۔ اس لئے چودھری صاحب نے تجھے یہاں بلا لیا ہے۔ اب تو یہاں رہے گی اور لپک کر کام بھی کرے گی۔۔۔ ہے نا؟ (رنّو نے ہولے سے اپنے سر کو ہاں میں ہلا دیا)۔۔۔ اچھا اب سن! یہ چائے کی پیالی دکھ رہی ہے نا تجھے، اسے لے جا اور دھو کر باورچی خانے میں ڈھنگ سے رکھ دے۔۔۔ چل! جا۔۔۔۔ شاباش۔ (رنّو چائے کی پیالی کو تھرتھراتے ہاتھوں سے اٹھاتی ہے اور باورچی خانے کی طرف لے کر چلی جاتی ہے)۔ ایک ہاتھ میں چائے کی پیالی اور دوسرے ہاتھ میں برتن والا منجھنا پکڑے وہ نل کے پاس بیٹھی ہوتی ہے کہ اچانک سے اس کی ڈبڈباتی آنکھوں میں ماضی کی ایک لہر جنم لیتی ہے جب کہ وہ ایک طشتری لے برتن دھونے کی جگہ جا ہی رہی تھی کہ پیچھے سے لپک کر اس کی اماں اس کے ہاتھ سے طشتری چھین لیتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی لاڈو کا ماتھا چومتے ہوئے بڑی شفقت سے کہتی ہے، بٹیا! ابھی سے اتنے کام کرے گی تو کمزور ہو جائے گی، ابھی تیرے کھیلنے کے دن ہیں، میرا بچہ خوب کھیلا کر۔۔۔۔ اماں کی یہ بات سن کر وہ اس کے آنچل میں چھپ جاتی ہے۔۔۔۔ رنّو ابھی اسی خیال میں گم آنسو بہا ہی رہی تھی کہ پیچھے سے ایک کڑک دار آواز آئی۔۔۔۔ارے لڑکی! ابھی تک ایک پیالی نہیں دھو پائی، یہ آواز کریمن کی تھی اور جب تک وہ گھوم کر اس کے سامنے آتی مارے ڈر کے رنّو کے ہاتھوں سے پیالی چھوٹ کر چار ٹکڑے ہو گئی۔۔۔۔۔ زمین پر پیالی کے ٹکڑوں کو دیکھ کر کریمن کے تیور آسمان پر چڑھ گئے اور اس نے اپنے ظالمانہ ہاتھوں سے رنّو کی پھول دار چوٹی کو جسے اس کی ماں نے آج صبح بڑے پیار سے باندھا تھا، بڑے ہی جارحانہ انداز میں کھینچتے ہوئے اس کے نرم گالوں پر تھپڑ رسید کرنا شروع کر دیئے اور وہ معصوم اپنی کمزور چیخوں کو صحیح طریقے سے نکال بھی نہ سکی۔ زور زور سے مار پڑنے کی وجہ سے جب رنّو کا چہرہ سرخ ہو گیا تو اسے اس انداز سے جھٹک کے چھوڑا کہ وہ زمین پر جا گری۔ کریمن یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی کہ منحوس نے آتے ہی نقصان کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد درد ہلکا ہونے پر رنو نے خود کو سنبھالا اور گھٹنوں کو سینے سے لگا کر خوب روئی۔ رو رو کر جب اس کا دل ہلکا ہوا تو اس کی نظروں کے سامنے اس کا پیارا سا بچپن منڈرانے لگا۔ اسے ماں کا پیار، باپ کی شفقت سب کچھ یاد آنے لگی۔ وہ اسی کرب میں سسک سسک کر وہیں پر سو گئی۔

اس یتیم کے ساتھ ایسا سلوک دیکھ کر میرا دل ایک ایسی سوزش کا شکار ہوا جس کی صدا ہی یہی تھی کہ ائے کاش! یہ سوزش کریمن کے دل میں بھی ابھرتی اور چودھری کے کوٹھی کے ہر فرد کے اندر جنم لیتی کہ وہ اس معصوم کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے۔۔۔ لیکن شاید ایسے لوگوں کے نصیب میں اتنی اعلیٰ ظرفی ہوتی ہی نہیں جس سے یہ دوسروں کے دکھ کو محسوس کر سکیں۔

اگلی صبح کے سورج کی کرنیں برچھیوں کی شکل میں رنو کے چہرے میں پیوست ہونے لگیں اور وہ دھوپ کی تمازت کو محسوس کرتے ہوئے اپنی پھولی ہوئی آنکھ کو مینجنے لگی اور اٹھ کر دالان میں آ کھڑی ہوئی۔ لڈن چودھری اور کریمن کو ڈھیر سارے ناشتے سے شکم سیر ہوتا دیکھ کر اس معصوم کے منہ سے ایک التجا نکلی: ''بیگم صاحبہ مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے''۔

کریمن جو پہلے سے ہی جلی بھنی بیٹھی تھی اور

پچھلی رات کا سارا قصہ بڑھا چڑھا کر رنّو کے خلاف چودھری کے کان بھر چکی تھی، چیخ کر بولی۔۔۔ تجھے بھوک لگ رہی ہے تو ہم کیا کریں! اتنی ہی بھوک کے نام پر موت آ رہی ہے تو مر جانا، کوئی کام ڈھنگ سے کرنا نہیں آتا منحوس کو، آئی بڑی بھوک بھوک چلانے۔ اب جاتی ہے یا تین چار تھپڑ بھی لگاؤں؟

ان زہریلی باتوں کو سن کر رنّو خون کے آنسوؤں کا گھونٹ پیتے ہوئے مڑنے لگی تبھی چودھری نے آواز لگائی۔ اے چھوری! سن.... پھر ایک نظر ان پیالیوں میں ڈالی، جن میں بچا کھچا کچھ ناشتہ رکھا تھا۔۔۔۔۔ اور کہا، لے اسے کھا لے اور بیگم جو بھی کہیں بھلی طرح کیا کر۔ سمجھی؟ چودھری کے اتنا کہتے ہی رنو پیالیوں پر ندیدے کی طرح لپکی اور جو کچھ تھا اٹھا کر ڈرتی سہمتی دالان سے نکل گئی۔۔۔ کریمن جو ابھی تک حیرت کی نگاہ سے چودھری کو دیکھ رہی تھی بولی۔۔۔ ہے میاں! یہ کیا بات ہوئی بجائے ڈانٹنے ڈپٹنے کے تم نے تو اسے ناشتہ ہی پکڑا دیا۔۔۔ چودھری جو ابھی حقے کو منہ لگائے بیٹھا تھا، الگ ہٹا کر ناک سے دھواں نکالتا ہوا کریمن پر نظر ڈالی اور کہا، لڈن اتنا بد دماغ نہیں ہے جتنا تو سوچ رہی ہے۔ ارے آج اس کو ناشتہ نہ دیتا تو گاؤں والوں کی نظر میں ہماری کیا عزت رہ جاتی۔۔۔ یہ سن کر کریمن داد دینے والے انداز میں مسکرا کر بولی واہ میاں واہ! تمہارے بھی کیا نشانے ہیں۔۔۔ ہینگ بھی نکل جائے اور ڈبا بھی مہکتا رہے۔

رنّو اب روز بہ روز ایسی ہی سختی کا سامنا کرتی۔ کریمن بیگم ایسی عورت تھی کہ گدھے کی طرح کوٹھی کا سارا کام اس سے کرواتی اور ہلکی سی کوتاہی ہو جانے پر کڑی سے کڑی سزا دیتی اور چودھری سے بھی کہہ کر پٹواتی۔ اوپر سے غضب یہ ڈھاتی کہ دو دنوں تک کھانا بھی نہ دیتی۔ چودھری لڈن، رنّو کے ماں باپ کے چھوٹے سے گھر اور چند بسوا کھیت پر یہ کہہ کر قبضہ جمائے بیٹھا تھا کہ میں رنّو کا کفیل ہوں، اس لیے اس کی ساری چیزوں کی ذمہ داری بھی میری ہے۔ جب ہوش سنبھالے گی تو خود ہی اس کے حوالے کر دوں گا۔

ایک دن رنّو نل کے پاس کپڑوں کا بڑا سا گٹھر لیے ہوئے دھونے کے لئے بیٹھی تھی کہ اسے رنّو، رنو، کی آواز سنائی دی۔ چاروں طرف نظر گھما کر دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا۔ وہ دوبارہ کپڑوں کے پاس آئی اور دھونا شروع کر دیا۔۔۔ ایک بار پھر اس نے محسوس کیا کہ اسے کوئی آواز دے رہا ہے۔۔۔۔ غور کرنے پر اسے دیوار میں ایک چھید نظر آیا جس میں سے اس کا بچپن کا دوست 'شابو' دیکھ رہا تھا۔ رنّو سارے کپڑے بھول کر اس چھید کی طرف بڑھی اور 'شابو' کو دیکھ کر چہکتی ہوئی آواز میں یکے بعد دیگرے کئی سوال کر ڈالے۔ ''شابو تم یہاں کیسے آئے؟۔۔ جھولا پڑا ہے؟۔۔۔ میری گڑیا کیسی ہے؟۔۔۔ چھپن چھپائی کھیلتے ہو گے نا؟۔۔۔ بہت مزہ آتا ہوگا نا تمہیں؟''

اس نوع کے کئی سارے سوالات کے بعد وہ بالکل خاموش ہو کر اپنے دوست سے آنسو چھپاتے ہوئے پلٹ کر اسی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور پھر سارے درد سمیٹے ڈبڈبائی نظروں سے آسمان کو تکنے لگی۔۔۔۔۔۔۔

یکے بعد دیگرے دن و رات کی پلٹن میں پانچ برس بیت گئے۔۔۔ نو سالہ رنّو اب چودہ برس کی ہوگئی۔۔۔۔۔ چارپائی پر بیٹھی کریمن نے منہ میں پان ڈالتے ہوئے تیزی سے آواز لگائی۔۔۔ رنّو۔۔۔ اوئے رنّو۔۔۔ سنائی نہیں دیتا ہے کیا۔۔۔۔ کب سے بلا رہی ہوں۔۔۔۔ آئی بیگم صاحبہ ابھی آئی۔۔۔ بس چودھری صاحب کا کمرہ جھاڑ رہی تھی۔۔۔۔۔ کہتے ہوئے رنو کوٹھی کے پچھلے حصے میں جہاں کریمن بیٹھی تھی آ کھڑی ہوئی۔۔۔۔۔ ایک ہاتھ میں جھاڑو اور دوسرے میں پوچھا لیے ہوئے کالی قمیص اور لال گھاگھرا جس میں مختلف رنگوں کا گوٹا لگا ہوا تھا اور لال اوڑھنی جس میں کالے رنگ کی بیل ہوئی تھی، پیچھے سے سر پر ڈالے چہرے پر کریمن کا رعب گھبراہٹ بن کر طاری تھا۔۔۔۔۔ ایسی حالت میں بھی رنّو پہلے سے بہت خوبصورت لگ رہی تھی، کوٹھی کے سارے کام کرنے کی وجہ سے وہ تمام ہنر جان چکی تھی۔ گاؤں میں اگر کوئی بھی کام کسی سے نہ بنتا تو رنّو، کریمن کی اجازت سے اسے بخوبی کر کے دے دیتی۔

ایک دن دالان میں چودھری لڈن اور کریمن، رنو کو چائے بنانے کا بول کر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کریمن نے کہا کہ ''میاں صاحب! اگر برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟''

آپ نے پنچایت میں رنّو کے جوان ہونے کے بعد اس کے باپ کی جائیداد رنّو کے حوالے کر دینے والی بات کر کے ٹھیک نہیں

کیا۔۔۔کل کو نہ کہا ہوتا تو آج وہ تمہارے ہی قبضے میں رہتی۔۔۔۔ کریمن کی بات ختم ہونے پر چودھری نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور قہقہے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔۔۔۔کریمن تو، تو بالکل بیوقوف نکلی رے۔ارے ہوش کے ناخن لے اور سوچ کہ کیا میں اتنا بد دماغ ہو گیا کہ پانچ سال جس کو اپنی کوٹھی میں رکھا، اسے اچانک سے کسی اور کو دے دوں گا۔۔۔۔۔!! چودھری بہت ناپ تول کر بات کہتا ہے۔۔۔ کریمن کھسیائی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور کہا۔۔۔اب کون سے تارے توڑنے والا کام کرو گے کل کو، اس کی جائداد نہ دو گے تو گاؤں والے باتیں بنائیں گے۔اور۔۔اور۔۔ ابھی کریمن مزید کچھ کہنے والی تھی کہ چودھری نے اس پر اپنی ہیکڑی جماتے ہوئے کہا۔۔۔ اور کیا۔۔۔ ہاں۔۔۔بول اور کیا۔۔۔۔اور سیدھے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔۔ دیکھ کریمن جائیداد تو تب حوالے کی جاتی ہے جب بچی بڑی ہو جائے اور اس کا بیاہ کسی اور سے ہو۔۔۔۔۔۔اور رنّو کا بیاہ تو اسی کوٹھی میں ہوگا، باہر تو ہوگا نہیں۔اس طرح جائیداد گھر کی گھر میں رہ جائے گی۔۔۔۔۔ چودھری اتنا کہہ کر خباثت سے ہونٹ کچلتے ہوئے مسکرانے لگا۔۔۔۔کریمن اس کی بات کے مقصد کو سمجھ کر اچھل پڑی اور بولی۔۔۔۔کیا ہوا ہے چودھری صاحب کو!۔۔۔۔۔۔کتنی چھوٹی ہے رنّو! باپ جیسے ہو تم اس کے۔۔۔۔ لفظ باپ سن کر چودھری طیش میں آ گیا اور کریمن کے جبڑے کو تیزی سے دباتے ہوئے بولا: ''باپ کا نام لیا تو تیرا وہ حشر بنا دوں گا کہ تو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہ جائے گی۔۔۔۔۔رنّو سے شادی صرف میں کروں گا، وہ دلہن ہوگی تو اسی کوٹھی کی۔۔۔۔'' ابھی چودھری اپنے تاؤ میں گرج ہی رہا تھا کہ دروازے سے کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی۔کریمن تیز تیز قدموں سے دوڑتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی، تو کیا دیکھتی ہے کہ چائے کی ٹرے پیالیوں کے ساتھ نیچے ٹوٹی پڑی ہوئی ہے اور رنّو انتہائی بوجھل جسم کے ساتھ سامنے کھڑی ہے، آنکھوں میں آنسو جمے ہوئے ہیں ہونٹ کانپ رہے ہیں، دماغ صدمے کی وجہ سے شل ہو رہا ہے، سارا جسم تھر تھر کانپ رہا ہے ۔۔اور وہ لڑکھڑا کر گرنے ہی والی ہے۔

اتنے میں چودھری باہر آیا اور رنّو کو دیکھ کر بولنے لگا، ارے کریمن! کھڑے کھڑے دیکھ کیا رہی ہے۔۔۔۔لے جا، اسے دلہن بنا۔آج ہی ہمارا نکاح ہوگا۔۔۔۔ کریمن جو اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی اور کچھ بولنا ہی چاہتی تھی کہ چودھری اس کی زباں بندی کرتے ہوئے بول پڑا کہ ایسے کیا دیکھ رہی ہے۔ ارے اتنے سالوں سے اسے پالا پوسا بڑا کیا، سارے ناز سہے تو کیا ایسے ہی جانے دوں گا۔۔۔۔۔کچھ نہ کچھ تو حق بنتا ہی ہے ہمارا۔۔۔۔!اور اگر میں نے نکاح کر لیا تو بدلے میں مجھے اس کے ابا کی جائیداد اور کوٹھی کو سنبھالنے والی عورت مل جائے گی۔ کیوں رنو۔۔۔؟ صحیح کہہ رہا ہوں نا میں۔۔۔۔؟ اتنا کہہ کر کریمن کو ایک گھوری لگائی اور مسکراتا ہوا چلتا بنا۔تھوڑی دیر بعد کریمن رنّو کو سجا سنوار کر دالان میں لے آئی جو کہ دلہن کے نام پر ایک لاش سے کم نہ تھی۔اسے دیکھ کر چودھری لڈن نے قاضی کو ایک اشارہ کیا اور چند ہی لمحوں میں رنّو چودھری کے شکنجے میں جکڑ گئی اور ایک زور دار چیخ مار کر وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔۔۔۔ ساتھ ہی ایک درد بھری آواز نکلی، آہ!۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس آہ میں اتنا درد تھا کہ زمین و آسمان لرز گئے، دنیا کا ذرہ ذرہ کانپ اٹھا، کائنات کا سارا نظام اور یہاں تک کہ وقت بھی ایک لمحے کے لیے رک گیا۔اس کلفت سے سہم کر سب کچھ تھم گیا۔لیکن اس بے حس دنیا پر اور مردہ ضمیر پر اس کا ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا۔ کاش!۔۔۔چودھری لڈن کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا کہ 'احساس' نام کی کوئی چیز ہے اور اسی احساس کے سبب چودھری رنّو کی تکلیف کو محسوس کر سکتا۔اس کی یتیمی کے درد کو بھانپ کر اسے اپنی ہتھیلی کا آبلہ بنا کر رکھتا۔اس کی مختصر سی دنیا اور حقیر سے مال و زر کی حفاظت کرتا اور جس بات کا ڈنکا بھری پنچایت میں پیٹا تھا، کاش! وہ واقعی اس سوچ کا حامل ہوتا۔ چلئے یہ بھی مان لیتے ہیں کہ اسے رنّو کی پرورش کے بدلے اس کے اماں ابا کی جائیداد چاہیے تھی، تو نرم انداز میں سمجھا بجھا کر بھی تو لیا جا سکتا تھا۔لیکن اس معصوم کے ساتھ نکاح کر کے نکاح جیسے پاکیزہ بندھن کو بے توقیر تو نہ کرتا۔اس نے اس شنیع عمل سے تو اس لفظ کی حرمت کو پامال کرتے ہوئے اسے ظلم کا مترادف بنا دیا۔۔۔افسوس!

شاید ایسے ہی بے حس، بنجر ضمیر مُردوں میں درد گیر احساسات کے بیج بوئے نہیں جاتے، جس کے بطن سے محبت، ہمدردی اور حسن سلوک نام کے پودوں کا اگنا ہی محال ہوتا ہے۔

☆☆☆

غزل

ڈاکٹر فریاد آزرؔ

بغیر لفظ معانی نکال لیتا ہے
وہ ریگزار سے پانی نکال لیتا ہے

بس ایک حرف کا اس کو سراغ مل جائے
سماج کوئی کہانی نکال لیتا ہے

اسے ذرا سی نئی بات کوئی بتلائے
ہر ایک بات پرانی نکال لیتا ہے

کوئی بھی بات خدا کو بری لگی تو پھر
وہ ساری چرب زبانی نکال لیتا ہے

جہاں بھی جان کے دشمن ہزار ہوں اس کے
انہیں میں راحتِ جانی نکال لیتا ہے

جہاں بھی آج ہیں توبہ شکن زلیخائیں
وہ خود میں یوسفِ ثانی نکال لیتا ہے

کسی بھی مصرعۂ اولیٰ کے چند لفظ کہو
وہ شخص مصرعۂ ثانی نکال لیتا ہے

جہاں پہ قحط ہو حسن و جمال کا آزرؔ
وہیں سے روپ کی رانی نکال لیتا ہے

غزل

طارق سخاؔ لکھنوی

ہے عجب شہرِ نگاراں میں سیاست کی ہوا
امن کے دالان میں پھیلی ہے نفرت کی ہوا

کاغذی پھولوں سے خوشبو غیر ممکن ہے یہاں
باغباں سے پوچھ لو تم خود بخالت کی ہوا

آسماں سے آئیں گے گھر میں فرشتے بالیقیں
صاف ستھری آپ کی گر ہے تجارت کی ہوا

رنجشیں بھی ہیں ضروری کچھ محبت کے لیے
چل رہی ہے چار سو کیسی عداوت کی ہوا

ہے دلِ عاجز کی اتنی سی تمنا یا خدا
بس اتر جائے رگوں میں اب اطاعت کی ہوا

خون کی شاید ہے پیاسی ایک بنجر سی زمیں
چھوڑ کرجائے نہ کوئی اب وراثت کی ہوا

یہ نہ سمجھو داخلے جنت میں ہونگے نام سے
کام آئے گی جبینوں پر ہدایت کی ہوا

تھا سنہرا دور اپنا مسکراتی تھی بہار
ایک دن پھر لہلہائے گی امامت کی ہوا

اذنِ ربی سے جہانِ کل پہ اک دن پھر سخاؔ
مثلِ طوفاں چل کے آئے گی خلافت کی ہوا

غزل

ساجد عارفی خیرآبادی
موبائل: 9369095249

غم ہی غم تھے نشاط کچھ بھی نہ تھی
صورتِ انحطاط کچھ بھی نہ تھی

موت سے کھا گئی شکست آخر
زندگی کی بساط کچھ بھی نہ تھی

سب تو اپنی انا کے مارے تھے
نسبتِ ارتباط کچھ بھی نہ تھی

غور جس دم کیا ہے تب سمجھے
آرزوئے نشاط کچھ بھی نہ تھی

پائی جنّت تو یہ کھلا عقدہ
دل کشیِ رباط کچھ بھی نہ تھی

قُرب پایا حروف کا ورنہ
آبروئے نقاط کچھ بھی نہ تھی

رات درہم نظامِ محفل تھا
زینتِ انضباط کچھ بھی نہ تھی

اس کی یادیں تھیں ہمسفر میری
مشکلِ پُل صراط کچھ بھی نہ تھی

یوں گنوا بیٹھے آبرو ساجدؔ
عشق میں احتیاط کچھ بھی نہ تھی

.....☆☆☆.....

غزل

شاہین زیدی
مدیرہ سہ ماہی "نوادر" لاہور (پاکستان)

جفا کی آگ بہت تیز ہوتی جاتی ہے
ہر ایک موج ستم خیز ہوتی جاتی ہے

تمام سمت اُگ آئے ہیں پھول وحشت کے
زمین جبر بھی زرخیز ہوتی جاتی ہے

رُتوں نے اس طرح شاخوں پہ زہر برسایا
ہر ایک ٹہنی ہی خوں ریز ہوتی جاتی ہے

تمام پھول ہی شاخوں پہ جاں بہ لب ٹھہرے
کلی بھی زہر سے لبریز ہوتی جاتی ہے

نظامِ ظلم و ستم کی ہے یہ فراوانی
نگاہِ وقت بھی چنگیز ہوتی جاتی ہے

سمٹ سکی نہ جو زنجیرِ جور میں شاہینؔ
وہ اِک گھڑی ستم انگیز ہوتی جاتی ہے

.....☆☆☆.....

تبصرہ

نام کتاب : سہ ماہی عالمی فلک (کتابی سلسلہ ۶)
مدیر : احمد نثار
ملنے کا پتہ : محمد علی روڈ، ہٹی کالونی دھنباد (جھارکھنڈ)
مبصر : سلیم انصاری (جبل پور)
(7070135643)

سہ ماہی عالمی فلک، دھنباد (جھارکھنڈ) احمد نثار کی ادارت میں شائع ہونے والا ایک خالص ادبی سہ ماہی رسالہ ہے، جس کے اب تک چھ ضخیم شمارے نکل کر ادب کے سنجیدہ حلقوں میں اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ عالمی فلک ایک ایسا رسالہ ہے جس نے قلیل مدت میں ہی نہ صرف اپنا معیار و مزاج حاصل کر لیا ہے بلکہ عصری ادب کی سمت و رفتار کا قطب نما بھی بن گیا ہے، جس کا سارا کریڈٹ رسالے کے مدیر احمد نثار کو ہی جاتا ہے۔

عالمی فلک کے زیر تبصرہ شمارہ نمبر چھ کے اداریہ میں مدیر کا یہ خیال فکر انگیز اور توجہ طلب ہے کہ زندگی سے وابستہ روشن اقدار اور عصری صداقتوں کی ترجمانی کرنے والا ادب ہی نیا اور زندہ ادب قرار پائے گا۔ عالمی فلک کے اس شمارے میں زیب غوری اور مناظر عاشق ہرگانوی کی حمد و نعت کے بعد کل گیارہ مضامین شامل کئے گئے ہیں، جس میں علی احمد فاطمی کا ایک قدرے طویل مضمون ''کہیں کچھ کم ہے'' بھی شامل ہے جس میں انہوں نے عصری نظموں کی سمت و رفتار کا تفصیلی اور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر رؤف خیر نے اپنے مضمون اقبال کے تضادات میں اقبال کے یہاں شخصی، شعری اور فکری تضادات پر کئی اہم فکر انگیز اور بحث طلب نکات اٹھائے ہیں جس پر آئندہ بھی گفتگو کے دروازے کھلے رہنے چاہئیں۔ عالمی فلک جیسے خالص ادبی رسالے میں ۲۶ صفحات پر مشتمل اسیم کاویانی کے مضمون کی شمولیت کا جواز میرے نزدیک اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ یہ مولانا محمد علی جوہر کی سوانح کے دو گمشدہ باب کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ اس شمارے میں شامل عشرت ظہیر، ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی، انور آفاقی، اور ڈاکٹر فخر الکریم وغیرہ کے مضامین خالص ادبی نوعیت کے ہیں اور دلچسپی سے پڑھے جانے کے متقاضی ہیں۔

فکشن کے باب میں کل دس افسانے شامل ہیں جن میں سب سے پہلا افسانہ نور الحسنین کا ''پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا'' مرزا غالب کی شخصی اور ادبی زندگی پر مرکوز ہے اور اپنے اسلوب اور بیانیہ کے سبب دلچسپ ہے۔ ''سنی ان سنی'' نذیر فتح پوری کا افسانہ ہے جو بین المتن کئی طرح کے سنجیدہ مباحث قائم کرتا ہے، نذیر فتح پوری بیک وقت شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، مترجم، محقق اور نقاد ہیں۔ لہٰذا ان کی شمولیت سے عالمی فلک کو وقار ملا ہے۔ اسلم جمشید پوری کا افسانہ ''کچی مٹی کا مکان'' انسانی رشتوں کے نشیب و فراز اور کھٹے میٹھے سماجی مسائل و مصائب کے گرد اپنی جڑیں تلاش کرتا ہے۔ ''چوٹ نوٹ کی'' حنیف سید کا ایک ایسا افسانہ ہے جو معاشرے کے ایک عام آدمی کے کرب اور روزمرہ کے مسائل کو نہایت خوبصورتی سے بیان کرتا ہے۔ حنیف سید موجودہ عہد میں ایک ہنرمند اور تخلیقی فکشن نگار ہیں۔ ''سفید جنگ'' ڈاکٹر ریاض توحیدی کا ایک علامتی افسانہ ہے جس میں انہوں نے لاش کو علامت بنا کر موجودہ عہد کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال کا آئینہ پیش کیا ہے اور اس کوشش میں وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں، اس کے علاوہ عالمی فلک کے صفحات میں ڈاکٹر عشرت بیتاب، غیاث اکمل، امتیاز غدر، ڈاکٹر صابرہ خاتون حنا اور صبیحہ تزئین وغیرہ کے افسانے بھی شامل ہیں جو یقینی طور پر عالمی فلک کو نیا رنگ و آہنگ اور تنوع عطا کرتے ہیں۔

منظومات کے باب میں راشد جمال فاروقی کی نظم ''امی کی جائے نماز'' ایک بہت عمدہ اور سچی نظم ہے جو ماں کے تقدس اور اس سے نظم نگار کے جذباتی رشتے کی شدت کو بخوبی بیان کرنے میں کامیاب ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر آفاق فاخری، جاوید ندیم، سرور حسین اور شارق عدیل وغیرہ کی نظمیں بھی قارئینِ عالمی فلک کو نئی جہت میں روشنی عطا کرتی ہیں۔ غزلوں کے باب میں شاہین، ظفر اقبال ظفر، عبد المتین جامی، خالد عبادی اور ساجد حمید کی غزلیں عالمی فلک کے وقار میں اضافہ کرتی ہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ عالمی فلک نے اپنے اجراء کے آغاز سے ہی دیگر زبانوں کے ادب کو بھی اردو قارئین تک پہنچانے میں دلچسپی دکھائی ہے، اس سلسلے میں تازہ شمارے میں سریش مجمدار کی بنگلہ کہانی کا ترجمہ پیش کیا ہے جسے عظیم انصاری نے اردو کے قالب میں منتقل کیا ہے۔ ساتھ ہی میری ترجمہ شدہ پنجاب شرومنی ساہتیہ اعزاز یافتہ موہن سپرا کی ہندی نظمیں بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر ہری دھل اور پرشانت کمار داس کی اڑیہ نظموں کا ترجمہ انور بھدرکی نے کیا ہے اور خوب کیا ہے۔

طنز و مزاح کے باب میں قیوم بدر کی تحریر گدھے کی شمولیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ عالمی فلک کے مدیر احمد نثار نے عالمی فلک کو متنوع اور کئی طرح سے دلچسپ بنانے کا فیصلہ کیا ہے اور اپنے اس مشن میں وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔

اپنی روایت کے مطابق عالمی فلک کے اس شمارے میں بھی ڈھیر ساری کتابوں پر سیر حاصل تبصرے شامل کئے گئے ہیں جس میں احمد نثار کے شعری مجموعے ''سرہانے میر کے'' پر ڈاکٹر علی احمد فاطمی، شعیب نظام کی کتاب ''عکسِ گم گشتہ'' پر پروفیسر کوثر مظہری اور غضنفر کی سوانح ''دیکھی لی دنیا ہم نے'' پر ریشا قمر کے تبصرے دلچسپ ہیں اور کتابوں کا بھرپور تعارف کراتے ہیں، اس کے علاوہ حسبِ دستور خطوط کے کالم میں پروفیسر طرزی، غضنفر، ڈاکٹر رؤف خیر، رینو بہل اور سلیم انصاری کے تفصیلی خطوط سے عالمی فلک کی اہمیت اور مشمولات کے مزاج و معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر سہ ماہی عالمی فلک کے زیر تبصرہ شمارہ نمبر چھ اپنے سابقہ شماروں کی طرح ہی متنوع اور معیاری ہے، اس کے علاوہ اس میں شامل قلمکاروں کی وابستگی بھی کسی مخصوص نظریۂ ادب سے نہیں، نئی نسل کے ان قلم کاروں کی شمولیت بھی عالمی فلک میں روا رکھی گئی ہے جن کے یہاں تخلیقی امکانات روشن ہیں اور وہ مستقبل میں اردو ادب کی باگ ڈور سنبھالنے کے اہل ہیں۔ میں عالمی فلک کے اتنے خوبصورت شماروں کے لئے بھائی احمد نثار کو مبارک باد دیتا ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ ان کے ادبی حوصلوں کو مزید استقامت عطا فرمائے آمین۔ ☆☆☆

تھے یا پھر اُدھار پر معاملہ کر لیتے تھے۔ سنجیدہ مضمون نگاری کی ابتدا مَیں نے (نیاز فتح پوری کے) نگار، نوائے ادب اور آجکل سے کی۔ پہلا مضمون نگار میں (اکبرالہ آبادی سخن فہموں اور طرفداروں کے درمیان) غالباً 1953 میں نکلا۔

نارنگ نے صاف صاف لکھا ہے کہ ''اُردو میری مادری زبان نہیں، میری ددھیال اور ننھیال میں سرائکی بولی جاتی تھی، میری ماں دہلی ہجرت کے بعد بھی سرائکی بولتی تھیں جو نہایت میٹھی، نرم اور رسیلی زبان ہے۔ لیکن مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اُردو میری مادری زبان سے دور ہے۔ اُردو نے شروع ہی سے دوئی کا نقش میرے لاشعور سے مٹا دیا۔ مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اُردو میرے خون میں جاری وساری نہیں۔ یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اُردو میری ہڈیوں کے گودے تک کیسے اُترتی چلی گئی، یقیناً کچھ تو جادو ہوگا۔ تاج محل کا کرشمہ مثالی ہے، میں اُردو کو 'زبانوں کا تاج محل' کہتا ہوں اور اکثر میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ زبان میرے لیے رازوں بھرا بستہ ہے۔ کیسے ہند آریائی کے بستے میں عربی فارسی ترکی کے رنگ گھلتے چلے گئے اور کیسے ایک دھنک بنتی چلی گئی کہ جنوبی ایشیا کے اکثر ممالک کے طول وعرض میں وہ آج 'لنگوا فرینکا' بھی ہے اور ایک ایسا ادبی اظہار بھی جس کے رس اور بالیدگی کو دوسری زبانیں رشک کی نظر سے دیکھتی ہیں۔'' نارنگ نے لکھا ہے:

''اردو ہماری صدیوں کی تہذیبی کمائی ہے، یہ ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کا وہ ہاتھ ہے، جس نے ہمیں گھڑا، بنایا اور سنوارا ہے، یہ ہماری ثقافتی شناخت ہے جس کے بغیر نہ صرف ہم گونگے بہرے ہیں بلکہ بے ادب بھی۔ میں نے بارہا کہا ہے کہ اُردو کو محض ایک زبان کہنا اُردو کے ساتھ بے انصافی کرنا ہے، یہ ایک طرزِ حیات، ایک اسلوبِ زیست، ایک اندازِ نظر یا جینے کا ایک سلیقہ و طریقہ بھی ہے، اس لیے کہ اُردو صدیوں کے تاریخی ربط وارتباط سے بنی ایک جیتی جاگتی زندہ تہذیب کا ایک ایسا روشن استعارہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال کم از کم برِصغیر کی زبانوں میں نہیں۔''

انھوں نے دِلّی یونی ورسٹی اور جامعہ میہ اسلامیہ (دہلی) میں پڑھایا۔ پروفیسر نارنگ ملک سے باہر دانش گاہوں میں بھی بلائے گئے۔ نارنگ کی پہلی تصنیف 'ہندوستانی قصّوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں' ہے جو پہلی بار 1959 اور دوسری بار 1961 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب پر نارنگ کو 1962 میں 'غالب ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ اس کے بعد سے اب تک نارنگ کی درجنوں کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ 2014 میں گوپی چند نارنگ نے 'غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات' ایک بے مثال تحقیقی اور تنقیدی کتاب پیش کی۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی پوری زندگی تصنیف وتالیف اور تدریس میں گزری۔ اُن کی کتابوں کی تعداد خاصی ہے جن میں سے چند کے نام ذیل میں درج ہیں:

ہندوستانی قصّوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں (1959 اور 1961)، سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ (1980 اور 1990)، اُردو افسانہ: روایت اور مسائل (1981 اور 1988)، انیس شناسی (1981)، لغت نویسی کے مسائل (1985) اور ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات (1993۔2007) نارنگ کو ادبی خدمات کے لیے ملک کے علاوہ بیرون ملک میں بین الاقوامی سطح پر بھی کئی ایوارڈ واعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔ جن میں سے نمایاں اعزازات اس طرح ہیں: صدر جمہوریۂ ہند کی جانب سے 'پدم شری' کا قومی اعزاز 1990، پدم بھوشن کا قومی اعزاز 2004، صدر پاکستان کی جانب سے اقبال صدی طلائی تمغۂ امتیاز 1977، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (''ساختیات پس ساختیات مغربی شعریات'' پر) 1995، غالب ایوارڈ، نئی دہلی 1985، سنت گیانیشور ایوارڈ، مہاراشٹر اُردو اکادمی 2004، قطر دوحہ فروغ اردو ادب ایوارڈ 2002، اقبال سمّان، مدھیہ پردیش سرکار 2011 اور صدر جمہوریۂ پاکستان آصف علی زرداری کے ہاتھوں 'ستارۂ امتیاز' 2012 میں دیا گیا۔

گوپی چند نارنگ نے جہاں کتابیں لکھیں وہیں ان پر بھی کتابیں اور دیگر رسائل کے خصوصی شمارے شائع ہوئے۔ نارنگ ملک کے سب سے بڑے اور اہم ادبی ادارے ''ساہتیہ اکادیمی'' کے صدر کے طور پر بھی کام کر چکے ہیں ان کا اقبال اس قدر بلند رہا کہ اعلا ادبی اعزازات کی نامزدگی میں ان کی رائے بڑی اہمیت کی حامل ہوتی تھی۔ جس کی وجہ سے اُردو کے کئی بڑے ادیبوں اور شاعروں کو مؤقر ایوارڈ دیے گئے اس سبب وہ متنازعہ بھی ہوئے مگر وہ اپنے انداز سے کام کرتے رہے۔ چند برس قبل (مرحوم) شمس الرحمان فاروقی اور نارنگ کے درمیان اختلاف کے نتیجے میں اُردو ادب کے لوگ دو دھڑوں میں بنٹ گئے تھے۔ دراصل نارنگ کے سیاسی حلقوں میں رسوخ نے بھی ان کی شخصیت کو جہاں پر کشش بنایا وہیں فطری طور پر ان کے مخالفین کا ایک گروہ بھی پیدا ہوگیا مگر ان اختلافات یا بعض کمزور واقعات کے باوجود اُن کا ادبی وقار باقی رہا۔ نارنگ کی متنوع ادبی خدمات اپنے وقار واعتبار کے ساتھ یاد رکھی جائیں گی۔

نارنگ جیسی زبان وبیان پر قدرت اب شاید وباید ہی ہو، ان کا لسانی علم وشعور بھی ایک روشن مثال تھا۔ ممبئی کے نہرو سینٹر کے ایک ادبی جلسے میں انھوں نے اپنی تقریر میں ایک جگہ ''زیرو بم'' (Zeer o Bam) کی ترکیب استعمال کی۔ ہم نے بھی سنی اور ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک سینئر صحافی کو بھی یہ ترکیب غلط محسوس ہوئی مگر انہوں نے بھرے جلسے میں زیرو کی۔۔۔ ''ی'' ۔۔۔کو بہ آواز بلند سے کھینچ کر پڑھا مگر وہ آواز نارنگ تک نہیں پہنچی، ہر چند کہ ہم بھی اس Zeer o Bam پر چونکے تھے مگر اپنے ہم پیشہ شخص کی یہ حرکت ہمیں خلافِ ادب محسوس ہوئی، گھر آنے کے بعد ہم نے لُغت دیکھا تو نارنگ کا زیرو بم صحیح ثابت ہوا۔ نارنگ کی خطابت بھی بہت پر کشش تھی اب ایسے خطیبِ ادب ہمارے ہاں ناپید ہیں، اس میں دو رائے نہیں ہوسکتی کہ نارنگ کی رحلت کئی اعتبار سے اُردو زبان وادب کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ خدا اُن کی روح کو سکون دے۔ نارنگ کے پسماندگان میں بیوہ محترمہ منورما اور دو ڈاکٹر بیٹے اروِن اور ترون امریکہ میں مقیم ہیں۔

ندیم صدیقی (ممبئی)

Vol: 5, Issue: 03
June - August .2022

Urdu Quarterly
Adabee Nasheman
Lucknow - 226003

RNI No. UPURDU /2017/74845
Per Copy : 25/-
Biannaul Subscription :300/-



Printed,Published & Prop. By AhmadRashiq at Nomani Press, Baroodkhana,Golaganj, Lucknow
and Published at 544C/168,Almas bagh,Hardoi Road,Lucknow
Editor: Dr. Saleem Ahmad